معارف

دسمبر ۲۰۲۰ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰/روپئے۔ فی شمارہ ۲۵/روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴/روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰/روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰/روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰/روپئے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰/روپئے ہے۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

✆ (Ma'arif Section) 06386324437

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری/منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۶ ماہ ربیع الآخر ۱۴۴۲ھ مطابق ماہ دسمبر ۲۰۲۰ء عدد ۶

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

نومبر کا مہینہ آتا ہے تو دارالمصنّفین کے لیے کچھ ایسی یادوں کو زندہ کر جاتا ہے جن سے خود ادارہ کو نئی زندگی کا احساس ہوتا ہے، علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن اسی مہینے میں اس دنیا اور اپنی دنیا دارالمصنّفین سے رخصت ہوئے، مرحومین کی یادوں سے نئی زندگی حاصل کرنے کے لیے ان کے یوم وفات ہی کو خاص کرنا ہماری تاریخ میں زیادہ پسندیدہ عمل نہیں سمجھا گیا، عصر جدید جس کی جدت بھی اب قدامت میں بدل چکی ہے، اس میں بہرحال یہ کہا اور سمجھا گیا کہ فرد کی اہمیت اور جماعت کی قوت کے لیے مذکورہ عمل کے جواز کی گنجائش ہے کہ اسی بہانہ کچھ بھولے بسرے افسانے یاد آجائیں، اسی مقصد کے لیے اس سال بھی ملک کے متعدد علمی افراد اور تعلیمی اداروں میں علامہ شبلی کی زندگی اور ان کے کاموں یا کارناموں کو یاد کیا گیا اور کہنا چاہیے کہ کچھ دیر ہی کے لیے دل و دماغ اس حرارت سے آشنا ہو گیا جو جرأت گفتار اور مستی کردار سے نمو پاتی ہے، علامہ شبلی کی چوبیس پچیس سال کی عمر سے ستاون سال تک کی زندگی کو عام طور سے ان کی بے مثال کتابوں، مقالات، خطبات اور ان کے قومی و ملی کاموں کے آئینہ میں دیکھا گیا، آئینے بھی وہ جو ایک خاص زمانہ میں اور ایک خاص سانچے میں صیقل کیے گئے، ان سے ذرا ہٹ کر شبلی کو دیکھا جائے تو وہ عالم شباب میں اضافی پریشانیوں اور فکروں کے ساتھ جن جسمانی امراض و آثار میں مبتلا تھے ان کی مثال امام شافعی کے مجسم مجموعہ امراض ہونے سے دی جاسکتی ہے، ایسی کوئی زیادہ عمر نہیں تھی جب روپیہ اور دولت کی قدر کے اعتراف کے ساتھ ان کو یہ کہنا پڑا کہ وہ ابراہیم ادہم ہیں نہ بایزید، دنیا کو حاصل کرنے کی خواہش کس کو نہیں ہوتی لیکن شبلی کہتے ہیں کہ اس کے لیے سلیقہ چاہیے، جوڑ توڑ، سازش، درباداری، خوشامد، لوگوں کی جھوٹی آؤ بھگت تو ان سے نہیں ہوسکتی، اڑتیس سال کی عمر میں وہ کون سی خلش بلکہ کرب تھا جس سے وہ گوشہ عافیت کو پسند کرنے کی بات کرتے، وہ کون سی فکر تھی جس نے تیس سال کی عمر میں ان کو ایسا کمزور بنا دیا کہ ذرا سا خط لکھنے پر ان کا سر پھرنے لگتا، فکر تھی تو بس ایسی بات کی کہ جس سے قوم کی خدمت بن آئے، استخواں کانپ کانپ جلنے والی آگ تھی تو یہی کہ اس وقت مسلمان سخت پراگندہ اور پریشان خیال اور پریشان عمل ہو رہے ہیں، کسی خاص مرکز پر ان کو لانا ہے ورنہ وہ ہر طرف سے بھٹکتے بھٹکتے آخر بالکل برباد ہو جائیں گے، دن رات کی فکر تھی تو یہی کہ دیہات میں جا کر تلقین اسلام کرنے

والے نہیں ملتے، اس کا علاج کیا ہوگا؟ اشاعت اسلام کی کارروائی تو تمام تر اسی پر موقوف ہے، پیر کٹ گیا تو شبلوی درد اس عزیمت میں بدل گیا کہ تکلیف گو سخت ہے لیکن ہمارے یہی بزرگ تھے جنھوں نے سر کٹوائے تھے، پاؤں کٹنے پر کیا رویا جائے؟ روئے تو شبلی تھے مگر اس وقت جب ترکی میں سلطان ترکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے خطیب نے پرجوش انداز میں کہا کہ اللھم انصر مولانا السلطان الغازی عبد الحمید خان، کون سا جذبہ تھا جس نے دیر تک یہ حال کیا کہ دل امڈا ہی چلا آتا رہا، ان کو افسوس ہوتا رہا کہ قبل از وقت معذور سے ہو گئے، چوبیس گھنٹے میں صرف ڈیڑھ دو گھنٹے ہی کام کر سکتے ہیں، کہتے تھے کہ عمر تھوڑی حسرتیں دل میں بہت، ان حسرتوں میں غنیمت اس وقت کو سمجھتے جو سیرت پر صرف ہو جاتا، ان کی خوشی صرف اس توقع میں رہ گئی کہ سیرت ان کے لیے وسیلۂ نجات بن سکتی ہے، اس سیرت نگاری پر بھی کیا کیا ستم نہ ہوئے، جن کو وہ آگ برسنے سے تعبیر کرتے لیکن سیرت نگاری کے لمحات میں ان کو محسوس ہوتا کہ نسیم کے جھونکے چل رہے ہیں، وہ کہتے کہ کسی کے خیالات پر باریکیوں ڈالا جائے، خود منافق بننا اور دوسروں کو منافق بنانا کیا ضرور ہے، ایسے میں کہہ اٹھتے کہ پہلے سے افسردہ تھا اب دل ہی ٹوٹ گیا، انتقال سے چند مہینوں پہلے درد بڑھنے کا گلہ بڑھتا گیا کہ یہ ہے ہمارا خلوص، خیر زمانہ گو حقیقت شناس نہیں تاہم سچ ہمیشہ نقاب میں نہیں رہے گا، یہ جملہ انتقال سے چار مہینے پہلے زبان سے نکلا اور ان کی کئی پیشین گوئیوں کی طرح جس طرح سچ ثابت ہوا اس کی دلیل ماہ نومبر میں ان کو یاد کیے جانے کی وہ رسم ہے جو اب قومی روایت بنتی جاتی ہے۔

یاد تو مولانا سید سلیمان ندوی کی بھی آنی چاہیے تیئیس نومبر کو وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو امام ابو یوسف، ابن قیم اور امیر خسرو کی مثالیں زندہ کر گئے، شبلی کی عظمتوں کے علم بلند ہوئے تو یہ سید صاحب کے ہاتھوں کی قوت اور سینے سے لگا لینے کا اعجاز تھا کہ انھوں نے دارالمصنّفین کی شکل میں شبلی کے خوابوں ہی کو نہیں خود شبلی کو فراموش نہ ہونے دیا، معارف میں ان کے شذرات دیکھیے تو ذرا وقفہ نہیں گزرتا جب ان کے صریر خامہ میں شبلی کے ذکر کا نغمہ ابھرتا اور نہ سنائی دیتا ہے، سید صاحب نے کس کس طرح اپنی تحریروں اور معارف کے ذریعہ قوم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا، یاد تو اس کو بھی کیا جانا چاہیے، ۳۸ء میں جو لکھا وہ آج زیادہ دھیان سے پڑھنے کے لائق ہے، لکھا کہ یہ بات صاف کہہ دینی ہے کہ برادرِ وطن بننے کے لیے کچھ جاننے کی ضرورت نہیں لیکن مسلمان بننے کے لیے کچھ جاننے کی

ضرورت ہے، وہ ایک سلبی حقیقت ہے اور اسلام ایجابی، اگر ہندو اپنی نسبت کچھ نہ جانے گا تب بھی ہندو ہی رہے گا لیکن مسلمان اپنی نسبت کچھ نہیں جانے گا تو وہ مسلمان نہیں رہے گا، اس لیے مذہبی تعلیم کا فقدان ہندویت میں خلل انداز نہیں لیکن مسلمان کے مسلمان ہونے میں خلل انداز ہوگا، اسی طرح سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی یاد کا بھی جواز ہے، ۱۸؍نومبر تاریخ وفات شبلی ان کی بھی تاریخ وفات ہے، عشق شبلی کا یہ بھی ایک رمز ہے، انہوں نے قومی رہنمائی کی وراثت کی اہمیت کو سمجھا، مثلاً بہار میں جے پی نرائن کی قیادت میں حکومت کا انقلاب آیا تو لکھا کہ عوام میں سیاسی شعور کی پختگی نہ ہونے کی وجہ سے ہیجان پسندی، اشتعال پذیری اور تلون مزاجی ہوتی ہے، اس لیے عوامی جمہوریت میں ارسطو کے خیال کے مطابق یہ خطرہ بھی رہتا ہے کہ احمق عاقل اور عاقل احمق بن جائیں، ملک کی جمہوریت کا وہ دور بہت ہی تشویشناک ہوگا جب مرکز اور ریاستوں میں مختلف نصب العین کی پارٹیوں کی حکومت ہوگی۔

نومبر کے حوالہ سے دارالمصنفین کے ان مرحومین کی یادوں کی ایک جھلک اس لیے بھی ہے کہ ملک کے موجودہ حالات خصوصاً سیاسی ومعاشی اور بڑی حد تک معاشرتی معاملات جس نہج پر ہیں اس میں ان بزرگوں کے افکار وخیالات کی بازخوانی ضروری ہے، سرد ہوتے انفاس میں گرمی یوم النشور دیکھنے کی چاہت ہو تو ان تحریروں سے تعلق بے فیض نہیں کہ یہ علم وہنر کے سرور کے ساتھ دل ناصبور کی متاع بھی ہیں۔

افسوس مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر اور مشہور خطیب اور اپنی قوم کی تعلیمی ترقی کے لیے ہمہ وقت کوشاں جناب کلب صادق کا انتقال ہوگیا، ان کی سب سے بڑی خوبی یکجہتی اور ہم آہنگی کا جذبہ تھا، انہوں نے کہیں بھی اور کبھی بھی کسی کے لیے دل آزار بات نہ کی، احترامِ آدمیت ان کے صحیفہ اخلاق کا پہلا صفحہ تھا، ایک افسوس ناک خبر مولانا عبدالباطن صاحب مفتی بنارس سے یہ ملی کہ مولانا جنید احمد بنارسی بھی رحمت الٰہی کے جوار میں پہنچ گئے، کیا باغ وبہار شخصیت تھی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم سے خاص تعلق تھا، گذشتہ سال تشریف لائے تو اسی محبت وشفقت کے ارمغان کے ساتھ اپنی کتاب ''سودن کا غیر ملکی سفر'' دی، کیا خبر تھی کہ یہ دیار شبلی کے لیے جنید کا آخری سفر ہوگا، رحمہم اللہ۔

معذرت لیکن مجبوری کے ساتھ یہ اطلاع ہے کہ رسالہ معارف کا زرِ سالانہ اب جنوری سے ۳۵۰ روپے اور ایک شمارہ کی قیمت ۳۰ روپے ہوگی اور آخر میں ظلی صاحب کے لیے درخواستِ دعا۔

مقالات

علامہ سید سلیمان ندوی اور مشاہیر جنوب

ڈاکٹر راہی فدائی

افادہ اور استفادہ باہم لازم و ملزوم ہونے کے ساتھ ہی عرفی اعتبار سے ازلی بھی ہیں، افادہ و استفادہ کی مختلف صورتیں اور متعدد جہات ہیں، کبھی یہ دونوں حکم اور تعمیل کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں، جیسا کہ ''کن فیکون'' کی صورت ہے اور کبھی یہ تعلیم و تعلم کی جہت سے رونما ہوتے ہیں، جیسا کہ ارشاد خداوندی ''علم آدم الاسماء کلھا'' سے ظاہر ہے، بہرطور افادہ و استفادہ کا یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ اس کائنات میں یہ عمل متواتر حرکت میں ہے۔ اس عمل سے متاثر جواہر و اعراض میں ''علم و فن'' کو ممتاز مقام حاصل ہے، کیونکہ بنی نوع آدم کی ''اشرفیت'' کا دارومدار اسی پر ہے۔ اگر یہ عمل رک جائے اور اس میں اضمحلال پیدا ہوجائے تو علوم و فنون کی تمام ترقیاں مفلوج ہو کے رہ جائیں گی، یہی وجہ ہے کہ افادہ و استفادہ کی راہوں کی مشکلات کو دور کرنے کی جد و جہد اہل دانش و بینش ہمیشہ کرتے رہے ہیں۔ اس کار خیر کے لیے کوئی جہت یا کوئی سرزمین مختص نہیں ہے۔ مشرق ہو کہ مغرب، شمال ہو کہ جنوب، جہاں کہیں سرچشمۂ بصیرت موجود ہو تشنہ گانِ علم اس کے اطراف جمع ہوجاتے ہیں اور اس سے سیراب ہونے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

عالم اسلام کا ایک عظیم منبع علم وادب علامہ سید سلیمان ندوی (ولادت ۱۸۸۴، وفات ۱۹۵۳ء) بن حکیم سید ابوالحسن کی ذات گرامی ہے۔ علامہ موصوف کی تحریروں اور تقریروں سے استفادہ کرنے والوں میں مشرق و مغرب کے افراد اور شمال و جنوب کے باشندے بھی شامل ہیں۔ جس طرح وہ شمالی ہند کو جس میں ان کا وطن عزیز ''دیسنہ'' (پٹنہ، بہار) واقع ہے، شدت کے ساتھ چاہتے تھے۔ اسی طرح جنوبی ہند سے بھی انہیں دلی لگاؤ تھا، اس کی وجہ سرزمین جنوب کی خصوصی تاریخیت کے علاوہ وہاں

گراؤنڈ فلور، 2nd، بی۔ کراس، 4th بلاک، H.B.R لے آؤٹ، بنگلور (کرناٹک)۔ 9448166536

موجود عصری و دینی درس گاہوں کی کثرت اور وہاں کے اہل ثروت کا تعلیمی شعور وقوی احساس ہے جس کے زیر اثر مالدار طبقہ مسلمانوں کی اعلیٰ وعمدہ تعلیم اور صالح و بہترین تربیت کے لیے اپنا سرمایہ بے دریغ خرچ کرنے میں کسی طرح کا تکلف محسوس نہیں کرتا تھا، علامہ سید سلیمان ندوی نے قطعہ جنوب سے اپنی قلبی وابستگی کا برملا اظہار اس طرح کیا تھا:

''اکتوبر (۱۹۳۷ء) کے آخر میں مجھے نو دس برس کے بعد ہندوستان کے اس دور دراز صوبے میں جانے کا اتفاق ہوا جس کو مجھ سے اور مجھ کو جس سے دلی انس ہے یعنی مدراس، مدراس کے اس مقام میں جو آرکاٹ کے نام سے مشہور ہے اور جو کبھی اسلامی حکومت کا ایک مرکز تھا اور جس کے کھنڈروں میں اب بھی اسلامی جاہ وجلال کی یادگاریں دفن ہیں، ایک نئی اسلامی حکومت کا آفتاب نکلنے والا ہے مگر یہ آفتاب سیاست کا نہیں بلکہ علم وفن اور کتاب وسنت اور اسلامی تبلیغ وتہذیب کا ہے اور اس کا نام جامعہ دارالسلام عمرآباد ہے، اس کے چاروں طرف مسلمانوں کی مشہور آبادیاں واقع ہیں یعنی آرکاٹ، ویلور، میل وشارم، پیرم پیٹ، آمبور، وانمباڑی، ترپاتور وغیرہ۔

آرکاٹ ویران ہوچکا ہے، میل وشارم مدراس کے مشہور تاجر نواب سی۔عبدالحکیم (متوفی ۱۹۳۸ء) کا وطن ہے اور یہاں ان کی طرف سے ایک انگریزی اسکول اور شفاخانہ قائم ہے۔ ویلور میں عربی کے دو مشہور پرانے مدرسے لطیفیہ (دارالعلوم لطیفیہ قائم شدہ ۱۱۷۹ھ) اور باقیات صالحات (ام المدارس مدرسہ باقیات صالحات قائم شدہ ۱۲۷۹ھ) واقع ہیں، پیرم پیٹ میں احناف اور اہل حدیث کے متعدد علما ہیں، آمبور روشن کمپنی کے ممتاز تاجر حاجی جلال (جلال عبدالکریم متوفی ۱۹۳۹ء) اور دوسرے ممتاز مسلمان تاجروں کا مسکن ہے، حاجی جلال صاحب کی طرف سے یہاں ایک ابتدائی مدرسہ اور جلالیہ اردو لائبریری ہے، ایک مسلمان تاجر کا لڑکیوں کا مدرسہ ہے، وانمباڑی میں اسلامیہ کالج، مدرسہ عربی ''معدن العلوم'' اور لڑکیوں کا ''مدرسۃ البنات'' اور دوسرے ابتدائی تعلیم کے اسکول ہیں اور ترپاتور میں مدرسہ عثمانیہ اردو اور دینیات کا ایک اچھا مدرسہ ہے، عمرآباد اب ایک نئی آبادی ہے جو ۱۹۲۳ء سے شروع ہوئی ہے''۔(۱)

جامعہ دارالسلام عمرآباد کا قیام شہرآباد ہونے کے ایک سال بعد ۱۹۲۴ء میں تاجر چرم الحاج کا کا محمد عمر صاحب (متوفی ۱۹۲۷ء) بن کا کا بہاءالدین صاحب کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔ بانی جامعہ کے مسلکاً اہل حدیث ہونے کے باوجود وسیع النظری اور وسعت فکری کا یہ عالم کہ انہوں نے افتتاح جامعہ کے لیے خانقاہ اقطاب ویلور کے سجادہ نشین مولانا حافظ سید شاہ عبدالقادر نقوی (متوفی ۱۹۵۸ء) اور علامہ ضیاءالدین محمد صولتی (متوفی ۱۹۴۱ء) مہتمم و ناظر مدرسہ باقیات صالحات ویلور کو مدعو کیا تھا، بقول مولانا حبیب الرحمن اعظمی عمری:

> ''۷ دسمبر ۱۹۲۴ء مطابق ۱۳۴۳ھ اتوار کی صبح جامعہ کے تعلیمی افتتاح کا اجلاس زیر صدارت صاحب زادگان حضرت مکان قطب ویلور منعقد ہوا، صدارتی تقریر حضرت مولانا ضیاءالدین محمد صاحب (مدرسۃ الباقیات الصالحات، ویلور) نے پیش کی اور متعدد علما کی تقریریں ہوئیں''۔(۲)

علامہ سید سلیمان ندوی نے بانی جامعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ایک اور مسلمان تاجر نے جو اہل حدیث ہیں یعنی حاجی عمر صاحب نے اپنے وطن گڑھ آمبور میں ''عمر آباد'' ایک نئی آبادی قائم کر کے خود تنہا اپنے صرفے سے ایک مدرسہ ''دارالسلام'' قائم کیا ہے، جس کی عمارت، سرمایہ اور اخراجات کے وہ تنہا کفیل ہیں اور تنہا کئی لاکھ کا سرمایہ مہیا کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں''۔(۳)

سرزمین جنوب سے علامہ موصوف کے متاثر ہونے کی متعدد مثالیں ہیں، ان میں سے چند کا ذکر یہاں کیا جارہا ہے۔ علامہ کا بیان ہے:

> ''خود شہر مدراس میں عربی کے متعدد مدرسے ہیں جن میں ایک سہوکار جمال محی الدین صاحب (متوفی ۱۹۲۴ء) مرحوم کا مدرسہ جمالیہ (قائم شدہ ۱۸۹۸ء) ہے، جس کے لیے ان کے صاحبزادے جمال محمد صاحب (متوفی ۱۹۴۹ء) اب دارالاقامہ کی نئی عمارت بھی بنوا رہے ہیں اور جس کے تمام اخراجات وہ خود اس کے وقف سے ادا کرتے ہیں، خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ مدرسہ جو پہلے ایرانی طرز کا تھا، اس میں ایک سال سے اب نئی طرز پر تجدید اور اصلاح کی گئی ہے، نصاب بھی نیا بن گیا ہے

جس میں قرآن پاک، حدیث شریف، فقہ، ادب عربی کے ساتھ ساتھ حساب جغرافیہ اور تاریخ کا اضافہ کیا گیا ہے، انگریزی لازمی کی گئی ہے"۔(۴)

مزید فرماتے ہیں:

"مدراس کے علاوہ مجھے اس سفر میں وشارم، آمبور، عمر آباد، وانمباڑی، بنگلور اور میسور بھی جانا پڑا، ہر جگہ بحمد للہ مسلمانوں کو ہشیار اور بیدار پایا، وشارم جو ایک چھوٹی سی جگہ ہے مگر مدراس کے اسلامی پایہ تخت آرکاٹ کے قریب واقع ہے اور مدراس کے مشہور فیاض و مخیر سی۔عبدالحکیم صاحب کا وطن ہے، موصوف نے یہاں دو شفاخانے قائم کیے ہیں، ایک جسمانی دوسرا روحانی، جسمانی شفا خانہ غربا کا ہسپتال ہے اور روحانی شفا خانہ لڑکوں کا مدرسہ ہے، جس میں اردو، فارسی، عربی، ٹامل، انگریزی اور دینیات کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں"۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے اٹھائیس سال کی عمر میں پہلی بار ۱۹۱۲ء میں جنوبی ہند کا سفر کیا اور شہر گلستان بنگلور میں تشریف لائے تو انہیں یہ شہر بہت پسند آیا، لکھتے ہیں:

"بنگلور ریاست میسور کا بہترین شہر ہے، آب و ہوا کے لحاظ سے تمام جنوبی ہندوستان میں مشہور ہے، آج کل وہاں اچھا خاصا جاڑا تھا اور موسم گرما میں بھی وہاں سردی گرمی کا اعتدال رہتا ہے، غرض یہ کہ وہاں گرمی کبھی نہیں ہوتی، اس شہر کا ایک حصہ لشکر گاہ انگریزی ہے اور یہی کانفرنس کا مقام تھا، یہ رزیڈنسی ہے، دوسرا حصہ شہر ہے جو ریاست کے ماتحت ہے، عمارتیں دور دور، پست کھپریل مگر صاف ستھری ہیں، انتظام عمدہ ہے، پولس اچھی ہے، نباتات کا ایک عالم یہاں ہے، زمین کا رنگ عموماً سرخ ہے اور نہایت زرخیز اور عمدہ ہے، "سرو" جس کے ایک فرد کا وجود بھی ہمارے باغوں کے لیے باعث سربلندی ہے، یہاں اس کا جنگل ہے، میوہ ہر قسم کا یہاں ہوتا ہے، انار میں نے یہاں بہت بڑے بڑے دیکھے"۔(۶)

علامہ موصوف چونکہ ایک مورخ و محقق تھے اس لیے ان کو جنوبی ہند کے اسلامی آثار کو دیکھنے کا بے حد اشتیاق تھا جس کا اظہار انہوں نے اپنے مقالے "سلطان ٹیپو کی چند باتیں کچھ چشم دید مشاہدات

اور کچھ تاریخی حقائق‘‘ کے ذیل میں اس طرح کیا:

’’میسور کی اس اسلامی حکومت کا دارالسلطنت شہر ’’سری رنگا پٹنم‘‘ تھا، ۱۹۱۲ء میں مجھ کو ’’مدراس ایجوکیشنل کانفرنس‘‘ کی شرکت کی غرض سے بنگلور جانا پڑا۔ یہ موقع ایسا تھا جس کو تاریخ کا ایک طالب ضائع نہیں کرسکتا تھا، چنانچہ کانفرنس سے فرصت پاکر میسور، سری رنگا پٹنم اور گڑھ آمبور کی میں نے سیر کی اور ان مقامات کی بچشم خود زیارت کی جہاں ہندوستان کے عظیم الشان انقلابات رونما ہوئے۔

اس ندی کو عبور کیا جو دکن اور میسور کی حد فاصل تھی، وہ سلسلہ کوہ نظر آیا جس کے دامن میں نیچے نیچے چل کر ٹیپو کی فوج دفعتاً موقع پاکر پہاڑ کو قطع کر کے کمپنی کی فوج پر بجلی کی طرح گرتی تھی اور وہ اس اچانک حملہ سے گھبرا جاتی تھی، ایک پہاڑ چڑھا جو گڑھ آمبور کے قریب تھا، جس پر ٹیپو کے جنگی استحکامات کے نشانات تھے، پتھر کی جو عظیم چٹانیں جن کو بجائے خود پہاڑ کہنا چاہیے اس طرح آکر مل گئی تھیں کہ ایک قلعہ بن گیا تھا، ایک بڑا سوراخ ان کے دہانہ پر تھا جس میں ایک آدمی سکڑ کر داخل ہوسکتا تھا، اندر نہایت کشادہ جگہ تھی، بیچ بیچ میں گولی چلانے کے لیے سوراخ تھے‘‘۔(۷)

علامہ سید سلیمان ندوی کل چار بار قدیم علاقہ مدراس و میسور میں تشریف لائے، پہلی بار ۱۹۱۲ء میں، دوسری بار ۱۹۲۵ء میں، پھر تیسری مرتبہ ۱۹۲۷ء میں اور چوتھی اور آخری مرتبہ ۱۹۳۷ء میں ان کا ورود مسعود ہوا تھا، اس کے بعد پھر کوئی موقع اس طرف سفر کا پیش نہیں آیا۔ پہلی بار وہ ’’مدراس محمڈن کانفرنس‘‘ بنگلور، منعقدہ بتاریخ ۲۸ جولائی ۱۹۱۲ء میں شرکت کی غرض سے شہر بنگلور تشریف لائے، اس کانفرنس کے روح رواں نواب غلام احمد کلامی (ولادت ۱۸۶۷ء، وفات ۱۹۴۷ء) جنوب کے سرسید کہلاتے تھے اور جنوبی ہند کے وسیع و عریض علاقے میں تعلیم کے فروغ کے لیے شب و روز کوشاں رہتے تھے، کلامی صاحب مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے رکن رکین تھے اور پھر مسلم یونیورسٹی کے فیلو رہے، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے رکن دوامی، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور انجمن حمایت اسلام، لاہور اور جامعہ اسلامیہ دہلی کے رکن اعظم بھی تھے، وہ سرسید کے شدید حامی اور ان کی تعلیمی تحریک کے مخلص معاون تھے، جس کا اعتراف انہوں نے اپنے ایک بیان میں کیا ہے:

"میری پہلی خوش قسمتی یہ تھی کہ میرے عالم شباب ہی میں باوجود میری ہر طرح کی بے بضاعتی کے مشہور آفاق سر سید احمد خاں مرحوم کی تحریرات کا مطالعہ حسن اتفاق سے مجھے نصیب ہوا، ان کے اثرات میرے دل و دماغ پر اب تک حاوی ہیں اور فی الوقت یہی نیک اثرات میری اسلامیت کا باعث ہوئے"۔(۸)

نواب غلام احمد کلامی ابن نواب جعفر حسین کلامی کا نسبی تعلق عربی النسل خاندان سے تھا، ان کے آبا ترچنا پلی (ٹمل ناڈو) کے قریب واقع ایک چھوٹی سی ریاست "رنجن گڑھ" کے حکمران تھے، تحریک آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں انگریزی حکومت نے انہیں شہر بدر کر دیا تھا، ان کی دو شادیاں ہوئیں، پہلا نکاح مشہور حکیم احمد علی کلامی کی دختر سے اور دوسرا نکاح "تارا منڈل" بنگلور کی سنگین جامع مسجد کے صدر محترم عزیز الدین مہکری کی صاحبزادی سے ہوا، ابتدا میں حاجی سر محمد اسماعیل سیٹھ (متوفی ۱۹۳۴ء) کے ساتھ تجارت میں شریک رہے، بعد ازاں خود مدراس اور کے۔جی۔ایف (کولار گولڈ فیلڈ) میں کامیاب تجارت کی، غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل شخص تھے، ان کی قومی و ملی خدمات کے اعتراف میں مہاراجہ میسور جیا چامراج وڈیسر (متوفی ۱۹۷۴ء) نے ان کو ۱۹۴۱ء میں "قائد الملک" کا خطاب اور تمغہ و خلعت سے نوازا، ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے رفیق کار خان بہادر عباس خان کے ساتھ مل کر شہر بنگلور میں "سنٹرل مسلم ایسوسی ایشن (C.M.A)" کی بنیاد ۱۹۰۷ء میں گورنمنٹ ایکٹ کے تحت رکھی، علاوہ ازیں "یتیم خانہ اہل اسلام"، معسکر، بنگلور اور مسلم ہاسٹل بنگلور کے بنیاد گزاروں میں سے تھے۔(۹)

علامہ سید سلیمان ندوی نواب کلامی کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے، دونوں مخلصین کے درمیان مراسلت جاری تھی، علامہ موصوف ان کی تعلیمی خدمات اور مالی قربانیوں سے واقف تھے، نواب کلامی نے سر سید کی تعلیمی تحریک کو آگے بڑھاتے ہوئے ماہ جولائی ۱۹۱۲ء میں "ساؤتھ انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کا سہ روزہ اجلاس بنگلور میں منعقد کیا تھا، یہ دراصل مدراس میں اواخر دسمبر ۱۹۰۱ء میں پہلی بار انعقاد شدہ "محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ" کا تسلسل ہی تھا جس کی صدارت محسن الملک سید مہدی علی (متوفی ۱۹۰۷ء) نے کی تھی، (۱۰) اور اس پندرہویں اجلاس کی ایک نشست کی صدارت نواب کلامی نے بھی کی تھی، اس اجلاس کے پانچ سال بعد ۱۹۰۶ء میں جنوب کے اہل حل و عقد نے

"مجلس تعلیمی اہل اسلام جنوبی ہند (South Indian Muslim Educational Committee)" قائم کرلی تھی، جس کا اولین جلسہ خان بہادر علامہ ضیاء الدین محمد صولتی (متوفی ۱۹۴۱ء) ناظر و مہتمم جامعہ باقیات صالحات ویلور و رکن دار العلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ کی صدارت میں اندرون جامعہ باقیات ہوا تھا۔اس کے چھ سال بعد ہی اسی کے تسلسل کے طور پر ۱۹۱۲ء میں بمقام معسکر، بنگلور تین روزہ عظیم الشان اجلاس منعقد ہوا جس کی دعوت علامہ سید سلیمان ندوی کو دی گئی۔اس اہم جلسہ کے ذمہ داروں کے سرخیل نواب کلامی تھے مگر وہ طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے، اس کا قلق علامہ کو بہت تھا۔علامہ نے جلسوں کے اختتام کے بعد ایک ذمہ دار محمد ابراہیم قریشی کے ہمراہ نواب صاحب کے مستقر کولار پہنچ کر عیادت کی جس کا تذکرہ علامہ نے اپنے عم محترم جناب سید عبدالحکیم دسنوی مقیم بمبئی کے نام تحریر کردہ خط مورخہ ۱۵/اگست ۱۹۱۲ء میں کیا۔خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"کانفرنس تین دن رہی، جسٹس عبدالرحیم پریسیڈنٹ تھے، ہندوستان (شمالی ہند) سے تین آدمی شریک تھے، میں، خواجہ کمال الدین اور مسٹر شوکت علی، کانفرنس کا مقصد جنوبی ہندوستان میں اشاعت تعلیم ہے، کانفرنس اپنا کام انجام دے رہی ہے، اس سے زیادہ جتنا "آل انڈیا کانفرنس" انجام دیتی ہے۔کانفرنس کے روح رواں بلکہ جنوبی ہندوستان کی تمام تحریکات کے روح رواں صرف دو شخص ہیں: نواب غلام احمد اور مسٹر قریشی بی۔اے۔نواب غلام احمد ایک باثروت شخص ہیں لیکن قومی محبت سے ان کا دل لبریز ہے، قومی کاموں سے ان کو اس سے زیادہ دلچسپی ہے جتنی ان کو اپنے ذاتی کاموں سے ہے، قومی مصائب پر ان کا دل اسی طرح جلتا ہے جتنا ذاتی مصائب پر، ہر سال اپنے ہزاروں روپئے قوم کے لیے نذر کرتے ہیں، آج کل بیمار تھے، شریک کانفرنس نہ ہوئے۔مسٹر قریشی (محمد ابراہیم قریشی) مدراس کا عبدالحکیم ہے، بی۔اے، بی۔ٹی ہے۔گورنمنٹ نوکر تھا مگر سب چھوڑ چھاڑ کر مدراس کے قومی ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہے، انگریزی زبان پر بلا کا قابو رکھتا ہے، مدراس کے اکثر روزانہ ہفتہ وار انگریزی اخبارات میں اس کے مضامین چھپتے رہتے ہیں۔

کانفرنس کا اجلاس تین دن رہا، مختلف تعلیمی ضرورتوں پر لکچر ہوئے، تعلیمی

تجاویز منظور ہوئیں، میں نے دو تقریریں کیں، ایک تعلیم نسواں پر جس نے حاضرین پر اثر کیا اور پسند کی گئی، اس تقریر میں ایک یوروپین خاتون کے مخفی اعتراضات کا جواب بھی تھا جس نے مجھ سے پہلے اسی موضوع پر انگریزی میں تقریر کی تھی، دوسری تقریر شب کو مذہبی تھی جس کا اثر خاطر خواہ نہ ہوا۔

......حسب قرارداد کولار روانہ ہوا، یہاں سے ڈھائی گھنٹہ کا راستہ تھا، نواب غلام احمد اور ان کے برادر بزرگ دونوں کو حددرجہ خلیق وخاکسار پایا، مل کر نہایت خوش ہوا کہ ہندوستان کی اسلامی خاکستر میں اب تک دبی دبائی چنگاریاں باقی ہیں۔

......(میسور میں) اب تعلیم پھیل رہی ہے، ایک ''محمڈن سینٹرل ایسوسی ایشن آف میسور'' قائم ہے جس کی طرف سے کچھ نائٹ اسکول قائم ہیں، کچھ واعظ ہیں جو مسلمان قیدیوں میں وعظ کہتے ہیں، چندہ طرابلس میں یہاں کے مسلمانوں نے بھی حصہ لیا اور تقریباً دو ہزار کا چندہ ہوا، یونیورسٹی کے لیے بیس ہزار کا فنڈ وصول ہوا، ایک فری ریڈنگ روم قائم ہے اور بھی قومی تحریکیں مثلاً مسلم ہال، تعلیم وظائف اور انتظام اوقاف اسلامیہ جاری ہیں مگر ان تمام تحریکات کا نفس ناطقہ کون ہے؟ نواب غلام احمد۔

میں نے پہلے خط میں آپ کو اطلاع دی تھی کہ ''محمڈن کانفرنس'' کی شرکت کے لیے مدراس (علاقہ مدراس یعنی جنوبی ہند) جارہا ہوں، ۲۵ جولائی (۱۹۱۲ء) کو یہاں سے روانہ ہوا اور ۸/اگست کو واپس آیا، یہ سفر میرے تمام سفروں میں سب سے زیادہ مفید و پُراز معلومات رہا''۔ (۱۲)

علامہ سید سلیمان ندوی کا اولین سفر جنوبی ہند انتہائی کامیاب ہوا۔ علامہ نے بنگلور، کولار، کے، جی، ایف، سری رنگا پٹنم کی سیر وتفریح کی، مختلف تاریخی آثار دیکھے، ان کے متعلق معلومات حاصل کیں، پھر بنگلور لوٹ کر براہ وانمباڑی مدراس روانہ ہوگئے، جس کی تفصیل مذکورہ طویل خط میں موجود ہے، مدراس میں علامہ کا قیام نواب کلامی کے کمرشیل آفس میں تھا، نواب صاحب کے نائب محی الدین پاشا نے مدراس میں ان کا استقبال کیا اور نواب صاحب کی کاران کے حوالے کردی، ڈیڑھ دن وہاں رہ کر علامہ بمبئی روانہ ہوگئے۔

علامہ سید سلیمان ندوی کا دوسرا سفر جنوب ماہ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں ہوا، جس طرح گذشتہ مرتبہ

جنوبی ہند کے فعال تعلیمی ادارہ ''ساؤتھ انڈیا مسلم ایجوکیشنل کمیٹی'' کے زیر اہتمام علامہ موصوف کو بنگلور مدعو کیا گیا تھا اسی طرح اس بار بھی اس ادارے کے ذمہ داروں نے علامہ کو مدراس تشریف آوری کی دعوت دیتے ہوئے گزارش کی کہ ''سیرت طیبہ'' کے عنوان پر ہفتہ بھر خطاب کریں تا کہ عوام الناس بالخصوص نوجوانان ملت کے قلب ونظر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے مختلف گوشے اس طرح روشن وتابناک ہوجائیں کہ پھر کوئی تاریک سایہ شکوک وشبہات کے ذریعہ ان کے ذہنوں میں اپنا مقام بنا نہ سکے، اسی مقصد کے پیش نظر افضل العلما ڈاکٹر عبدالحق کرنولی (متوفی ۱۹۵۸ء) ابن شمس العلما مولانا محمد عمر صاحب (متوفی ۱۹۴۶ء) نے خطبات سیرت کے منصوبہ کے لیے اپنے مخلص دوست وکرم فرما ملک التجار الحاج جمال محمد راؤتر صاحب (متوفی ۱۹۴۹ء) کو آمادہ کرلیا، یہ وہی پراجکٹ ہے جس کے تحت علامہ محمد اقبال (متوفی ۱۹۳۸ء) بھی ماہ جنوری ۱۹۲۹ء کے اوائل میں مدراس تشریف لائے تھے۔

ڈاکٹر عبدالحق کرنولی (ولادت ۱۹۰۰ء، وفات ۱۹۵۸ء) سلسلہ نظامیہ کے جید عالم تھے ''گورنمنٹ محمڈن کالج'' سے بی۔اے اور مدراس یونیورسٹی سے ایم۔اے کے اسناد حاصل کیے، حکومت کی جانب سے ۱۹۲۶ء میں ڈی۔فل (D.Phil) کی اعلیٰ سند کے لیے آکسفورڈ یونیورسٹی، لندن روانہ کیا گیا، جہاں انہوں نے مشہور مستشرق پروفیسر ڈی۔ایس۔مارگولیوتھ کی نگرانی میں عربی شاعر ہبت اللہ بن ثناء الملک کے دیوان کی تحقیق وتدوین فرمائی، اسی سلسلہ میں وہ جامعہ از ہر مصر بھی گئے جہاں علامہ طنطاوی کی صحبتوں سے استفادہ کیا، ۱۹۳۸ء میں پریسی ڈنسی کالج، مدراس کے پرنسپال مقرر ہوئے، (۱۳) حکومت وقت نے ۱۹۴۴ء میں ''خان بہادر'' کا خطاب عطا کیا، (۱۴) ان کی صلاحیتوں کے مدنظر مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۹۵۸ء) نے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے دور ابتلا میں ان کو پرووائس چانسلر نامزد کیا گیا۔ چند ماہ کی قلیل مدت میں مسلم یونیورسٹی کے شدید الجھے مسائل کو باحسن طریق حل کردیا، جس کے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

> ''کیا اپنے قول اور اپنے ظاہر سے اور کیا اپنے عمل اور اپنے باطن سے، لڑکوں اور استادوں دونوں میں ایک اسلامی انقلاب کی داغ بیل ڈالی، گویا وقار الملک مرحوم کا دور لوٹ آنے لگا اور وہاں وہ اثر چھوڑا کہ کم لوگوں نے اپنی اتنی اچھی اور سچی یادگار علی گڑھ میں چھوڑی ہوگی''۔(۱۵)

”پروفیسر رشید احمد صدیقی نے برملا اعتراف کیا کہ ”انہوں نے (ڈاکٹر عبدالحق کرنولی نے) علی گڑھ والوں کے دلوں میں اپنے لیے اتنے پاکیزہ اور قابل احترام خیالات وجذبات پیدا کرلیے جو اتنی کم مدت میں آج تک کوئی نہ پیدا کرسکا“۔(۱۶)

علامہ سید سلیمان ندوی کے ڈاکٹر عبدالحق کرنولی کے ساتھ گہرے مراسم تھے، دونوں کے درمیان خط و کتابت بھی جاری تھی، یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب کی دعوت پر ماہ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں مدراس تشریف لاکر مسلسل آٹھ دن لکچرس دیے، جس سے عوام وخواص دونوں بے حد متاثر ہوئے، علامہ موصوف نے اس کی تفصیل نومبر ۱۹۲۵ء کے معارف کے شذرات میں بیان کی:

”شہر مدراس میں ”جنوبی تعلیم اسلامی انجمن“ کے زیر اہتمام مسلمان طلبہ کے سامنے اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق آٹھ خطبے مسلسل دیے، ان خطبوں کے خلاصے وہاں کے روزنامہ انگریزی اخبار ”ہندو“ اور ”ڈیلی ایکسپریس“ میں برابر نکلتے رہے اور دلچسپی سے سنے اور پڑھے گئے، اکثر حضرات کا اصرار ہے کہ ان خطبات کو علاحدہ رسالہ کی صورت میں شائع کردیا جائے، اس اصرار کی تعمیل کا خیال پیش نظر ہے۔

شہر مدراس کے علاوہ اس سلسلہ میں بنگلور میں تین خطبے، وانمباڑی میں دو، ترپاتور میں ایک خطبہ مختلف عنوانات پر دیے گئے۔ بنگلور میں ”دین کامل“ کے عنوان پر پہلا خطبہ بہت بڑے مجمع میں دیا گیا تھا، جس میں عام مسلمانوں کے علاوہ ریاست میسور کے بعض بڑے ہندو عہدہ دار اور بعض انگریز اور بنگلور کے اکثر تعلیم یافتہ اصحاب شریک تھے، ایک مسلمان یوروپین خاتون جس کا اسلامی نام زینب ہے وہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ جلسہ میں موجود تھیں اور باوجود اردو کم سمجھ سکنے کے بہت غور سے تقریر سنتی رہیں، میری تقریر سے پہلے ’میسور یونیورسٹی“ کے فلسفہ کے پروفیسر واڑیا نے جو پارسی ہیں، اسلام اور پیغمبر اسلام پر پرمغز تقریر نہایت فصیح وبلیغ انگریزی میں کی، اسلام کی اس خود رواشاعت کو دیکھ کر حیرت کی ضرورت نہیں کہ آفتاب کی روشنی دنیا میں خود چمکتی ہے، دنیا اس کو نہیں چمکاتی۔

آخر میں اپنے دو حریف فن افضل العلما پروفیسر عبدالحق ایم۔اے اور شمس العلما

مولوی عبدالرحمٰن صاحب شاطرؔ مصنف ''اعجاز عشق'' کی مہربانیوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے ہمیشہ مسافرنوازی کا حق ادا کیا۔

ایم ۔جمال محمد (راوٗتر) صاحب جو ان خطبات کے اصل محرک تھے، وہ مدراس کے ایک روشن خیال، شریف اخلاق، فیاض اور حد درجہ متواضع تاجر ہیں، دیگر متفرق عطیوں کے سترہ سو ماہوار صرف تعلیمی درس گاہوں پر اپنے پاس سے صرف کرتے ہیں، مجھے خوشی ہے کہ میری تحریک پر انہوں نے پچاس روپے ماہوار بمد وظائف، دارالعلوم ندوۃ العلما کے لیے بھی مقرر کر دیا ہے، جزاہ اللہ خیراً، ارکان ندوہ دل سے ان کے شکر گزار ہیں۔

مدراس نے ہمیشہ ندوہ کی مدد کی ہے، دارالاقامہ کی مد میں بھی اس نے کچھ دیا ہے مگر میں اپنے اس سفر کے معاوضے میں ''دارالعلوم'' میں مسجد کی تعمیر کا خرچ احباب مدراس سے وصول کر کے چھوڑوں گا، ہمارے مخلص کرم فرما حاجی جلال عبدالکریم صاحب (۱۷) کو اپنا وعدہ یاد رکھنا چاہیے، بی ۔عبدالحکیم صاحب سے بھی امید ہے کہ وہ اپنے ایک ہزار کا وعدہ فراموش نہ کریں گے۔

مولوی عبدالرحمٰن شاطرؔ کو لوگ ان کے ''اعجاز عشق'' کے سبب سے اکثر جانتے ہوں گے، وہ شاعر اور فلاسفر ساتھ ہیں، وہ اتفاق سے اسٹیشن پر میری مشایعت کی غرض سے جب پہنچے تو گاڑی چل چکی تھی، مگر انہوں نے فلسفیانہ متانت کی رفتار کو تیز کر کے فلسفہ کے دامن پر داغ نہ لگانا چاہا، پہلے انہوں نے شاعری یہ کی کہ اپنے سچے ''سلمہ ستارے'' کا ہار جو ان کے شعروں کی طرح نظم ثریا تھی، اپنے ہاتھوں سے اس گنہگار کے گلے میں نہ ڈال سکے تو اس کو ڈاک سے بھیج کر میری عزت افزائی کی۔

مدراس میں جو سب سے عجیب چیز دیکھی وہ ایک شاعری کا گھرانا تھا، شاطرؔ صاحب کے والد مرحوم فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے، شاطرؔ صاحب خود اردو اور فارسی کے برجستہ گو شاعر ہیں، ان کی اہلیہ محترمہ اور ان کی دو صاحبزادیاں بھی فارسی کی شاعرہ ہیں، شاطر صاحب نے فرمائش کی کہ میں ان خواتین کو مصرع طرح دوں، چنانچہ اپنی

واپسی کی مناسبت سے حافظ شیرازی کا یہ مصرع زبان پر آیا:

"بہ شہر خود روم و شہر یار خود باشم"

دو تین گھنٹے کے بعد ان کی اہلیہ نے اس پر تین شعر اور ان کی چھوٹی صاحبزادی نے پانچ شعر کہہ کر بھیجے، بڑی صاحبزادی نے ایک اور طرح امتحان دینا منظور کیا کہ نثر میں کوئی واقعہ ان کے حوالہ کردوں، وہ اس کو نظم کردیں گی، میں نے سیرۃ النبیؐ حصہ دوم سے حضرت جابرؓ اور ان کے یہودی قرض خواہ کا واقعہ نکال کردیا، تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے اس واقعہ کو "شاہنامہ" کی بحر اور زبان میں مثنوی کے دس پندرہ شعر میں نظم کرکے بھجوادیے، نثر کا پہلا فقرہ یہ تھا "حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں" انھوں نے نظم میں ادا کیا "روایت کند جابرِ نامدار"۔

آج ہندوستان میں عورتوں کی نفس فارسی تعلیم کمیاب ہے، پھر فارسی میں شعر کہنا اور اس طرح فی البدیہہ شعر کہنا، کس درجہ حیرت انگیز ہے اور یہ سب پرانی طرز تعلیم کے ساتھ انجام پایا ہے، "بارك الله في بيت العلم هذا"۔(۱۸)

شمس العلما نواب عبدالرحمٰن شاطر مدراسی (متوفی ۱۹۴۳ء) جید عالم ہونے کے علاوہ بلند پایہ فلسفی اور استاد شاعر بھی تھے، علامہ اقبال (متوفی ۱۹۳۸ء) سے ان کی مراسلت تھی، اقبال کی شاعری کے بڑے مداح تھے، حضرت شاؔطر کی مثنوی "اعجاز عشق" کو اہل علم نے بہت پسند کیا تھا، شاطرؔ کے والد ماجد نواب مولوی عبدالغنی خاں بہادر فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے، تخلص امیرؔ تھا، خانوادۂ والا جاہی سے قریبی رشتہ داری کی وجہ سے "نواب" پکارے جاتے تھے، علامہ سید سلیمان ندوی حضرت شاطرؔ کے کمالات علمی سے بہت متاثر تھے اور شاطرؔ کی شاعری کے تہہ دل سے معترف بھی۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے جن دو شخصیتوں کو اپنا "حریف فن" کہا، ان میں سے ایک ڈاکٹر عبدالحق اور دوسرے حضرت شاطرؔ ہیں، علامہ موصوف کے مستحکم تعلقات نہ صرف ڈاکٹر عبدالحق صاحب سے تھے بلکہ ان کے والد ماجد شمس العلما مولانا محمد عمر صاحب (ولادت ۱۸۶۸ء، وفات ۱۹۴۶ء) سے بھی تھے، مولانا عمر صاحب مدرسہ فیض عام، کانپور کے طالب علم رہے، جہاں انھوں نے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱۹۰۵ء)، مولانا احمد حسین کانپوری، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (متوفی ۱۸۸۰ء) اور مولانا اشرف علی

تھانویؒ (متوفی ۱۹۴۳ء) سے شرف تلمذ حاصل کیا اور وہیں سے ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں فارغ التحصیل ہوئے، جس دن مولانا عمر اوران کے ساتھ مزید تیرہ طلبۃ العلم کی فراغت ہوئی، اسی دن یعنی ۱۵؍شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲؍اپریل ۱۸۹۴ء ہی کو ندوۃ العلما کے سہ روزہ اولین اجلاس کی ابتدا مدرسہ فیض عام میں مولانا لطف اللہ علی گڑھی کی صدارت میں ہوئی۔(۱۹) مولانا عمر کی علمی اور قومی خدمات کی وجہ سے حکومت نے ۱۰؍جون ۱۹۴۶ء کو "شمس العلماء" کے خطاب سے نوازا، مگر افسوس اسی سال ان کا وصال ہوگیا، علامہ سید سلیمان ندوی نے اس پر تعزیت ادا کرتے ہوئے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

"............اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کے لیے اپنے ایک بندے کو مامور کیا، ان کا نام مولانا حاجی محمد عمر صاحب تھا، ان کے علم وفضل اور نیکی وتقویٰ کے سبب سے حاکم ومحکوم دونوں طبقوں میں ان کو ہر دلعزیزی حاصل تھی، حکومت نے شمس العلما کے لقب سے ملقب کیا تھا اور عام مسلمانوں نے بھی ان کی دینی قیادت اور رہبری کو قبول کیا، موصوف نے اسّی برس کی عمر پائی اور یہ پوری عمر علوم دین کی تعلیم و تدریس میں بسر کرکے گزشتہ ۲ جولائی ۱۹۴۶ء کو وفات پائی، ان کی وفات سے اس علاقے میں علوم قدیمہ کا خاتمہ ہوگیا، مرحوم مولانا احمد حسین صاحب کانپوریؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے اور جس جلسہ میں ندوہ کی ابتدا کی تحریک کی گئی اسی میں ان کی دستار بندی ہوئی تھی، ۱۳۱۱ھ میں کانپور سے فارغ ہوکر واپسی کے بعد کرنول (آندھرا) میں قیام کیا، آخر تک وہیں قیام پذیر رہے، وہاں کے چھوٹے سے مدرسہ کا انتظام جس کی ماہوار آمدنی پندرہ بیس روپئے سے زیادہ نہ تھی، اپنے ہاتھ میں لیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے کام میں برکت دی، مرحوم کے مساعی کی بدولت آج اس کے املاک وعمارات تقریباً تین لاکھ کے مساوی ہیں، آندھرا اور مدراس کے اردو، فارسی اور عربی اساتذہ میں تقریباً تین ربع بالواسطہ یا بلاواسطہ ان سے فیض تلمذ رکھتے ہیں، کانپور میں حضرت مولانا تھانوی سے مثنوی پڑھی تھی اور ان کے سلسلۂ ارادت میں شامل تھے، مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے بھی فیض پایا اور مسلسلیت وغیرہ کی اجازت لی تھی،

افسوس ہے کہ وہ گنجینۂ علم مفقود ہوگیا، رنج اس بات کا ہے کہ یہ جگہ کچھ ایسی خالی ہوئی ہے کہ اب اس کے پُر ہونے کے آثار نہیں، اسلاف کی زندگی کا نمونہ تھے، باوجود ہر طرح کے آرام کے ہمیشہ خود اختیاری فقر کی زندگی پسند کی اور دنیاوی املاک میں سے نہ زمین چھوڑی نہ مکان اور نہ نقد، ہمیشہ یہی آرزو رہی کہ دنیا سے ایسے روانہ ہوں کہ ترکہ کا حساب نہ دینا پڑے، وہی بعینہٖ پیش آیا، رحمہ اللہ"۔(۲۰)

علامہ سید سلیمان ندوی مدراس سے بنگلور تشریف لائے تو شہر گلستاں میں ان کے تین خطبے ہوئے، اس دوران ان کو مشہور و معروف مورخ و مصنف اور بلند پایہ صحافی محمود خاں محمود بنگلوری (ولادت ۱۸۸۸ء، وفات ۱۹۵۸ء) نے بتاریخ ۲۲/اکتوبر ۱۹۲۵ء اپنے ہمراہ شہر میں موجود شاندار کتب خانہ "مسلم لائبریری" (قائم شدہ ۱۹۱۲ء) کا معائنہ کرایا، محمود خاں اس لائبریری کے بانیوں میں سے تھے اور اس وقت سکریٹری کے عہدے پر فائز تھے، علامہ نے اس ادارے کے تفصیلی معائنے کے بعد "کتاب الآراء" میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا:

۲۲/اکتوبر ۱۹۲۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آج مجھے مسلم لائبریری کو دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی، مسلمان نوجوانوں میں قومیت کی اشاعت اور صحیح خیالات کی تبلیغ، مذہب سے واقفیت، علم سے ذوق اور ادب و زبان کے شوق کا یہی ذریعہ ہے کہ ہر جگہ دارالمطالعہ قائم کیے جائیں، یہ لائبریری ۱۳/سال سے قائم ہے، یہ سب سے بڑی دلیل اس کی زندگی کی ہے، عموماً مسلمانوں کا کام مستقل نہیں ہوتا، لیکن اس لائبریری کا اتنے سالوں تک قائم رہنا آئندہ ضمانت ہے اور اس کے ممبروں کی کوشش و محنت کو ثابت کرتا ہے، اس لائبریری میں ملک کے تمام اچھے اخبارات اور رسالے آتے ہیں، اس کے ۱۵۰/ممبر ہیں، ایک سو کتابیں اس کی ملکیت میں ہیں، غرض ہر حیثیت سے یہ لائبریری قابل تعریف اور سزاوار تحسین ہے، یہ (بھی) ہے کہ اس کے ذریعہ سے یہاں اردو کی اشاعت بخوبی ہو سکے گی"۔(۲۱)

محمود خاں محمودؔ مورخ کے علاوہ شاعر بھی تھے، ان کے والد صفدر خاں انگریزی فوج میں صوبے دار

کی حیثیت سے سکندرآباد میں خدمت انجام دے رہے تھے، صفدر خاں صاحب ۱۸۹۶ء میں فوج سے وظیفہ یاب ہوکر سکندرآباد سے بنگلور منتقل ہوگئے، اس وقت محمود خاں سات سال کے تھے، انہوں نے عربی مولانا حافظ سید محمود، مالک مطبع فردوسی بنگلور سے سیکھی، اردو و فارسی کی تعلیم بلند پایہ شاعر و کاتب مولانا شہاب الدین سلیم ویلوری (متوفی ۱۹۱۵ء) اور مشہور معلم و مدرس قاضی محمد عبداللہ حسین خلیل بنگلوری (متوفی ۱۹۳۳ء) وغیرہ جید اساتذہ سے حاصل کی، بعدازاں سینٹ جوزف کالج کے ماہر اساتذہ فادرویزاک، فادر ویذ ڈور اور فادر شالک کے زیر اثر تحقیق و تاریخ کا ذوق پیدا ہوا، (۲۲) اسی کا نتیجہ تھا کہ محمود خاں صاحب نے شہرہ آفاق تاریخی و تحقیقی کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے ''تاریخ سلطنت خداداد'' (مطبوعہ ۱۹۳۴ء)، ''تاریخ جنوبی ہند'' (مطبوعہ ۱۹۳۹ء) اور ''صحیفہ ٹیپو سلطان'' (مطبوعہ ۱۹۴۷ء) ہندو پاک میں متعدد بار شائع ہوئیں، خصوصاً تاریخ سلطنت خداداد کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، علامہ سید سلیمان ندوی نے ''معارف اگست ۱۹۳۴ء'' کے شمارے میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

> ''تاریخ سلطنت خداداد، میسور کی نامور سلطنت، نامور بانی حیدر علی اور اس کے جانشین ٹیپو سلطان کی مکمل تاریخ ہے، یہ ایک طرف مواد اور دلائل اور دوسری طرف جوش و خروش اور عقیدت کے ساتھ مرتب کی گئی ہے، سلطنت خداداد کے مصنف اس سے پہلے ''تاریخ سلطان شہید'' کے نام سے ٹیپو سلطان کی سوانح عمری شائع کر چکے ہیں، اب اس کتاب کے ذریعہ انہوں نے حیدر علی اور ٹیپو دونوں کی سوانح عمریوں اور جنگی و عمرانی کارناموں پر مشتمل مختلف ابواب آگے پیچھے بڑھا کر سلطنت کی تاریخ مکمل کردی ہے، بلاشبہ ان مجاہدین کے کارناموں سے اردو زبان اس وقت تک تہی دامن تھی، مصنف نے یہ بڑی کمی پوری کی، ترتیب کتاب میں مصنف نے فارسی اور انگریزی کے قریب قریب سب ماخذوں سے فائدہ اٹھایا اور کوشش کی ہے کہ سلاطین کے کارناموں کے ساتھ ان کے حریف طاقتوں انگریز، نظام اور مرہٹوں کے باہمی تمام ساز و باز کو کھول کر رکھ دیں، یہ کتاب ہندوستان میں انگریزوں کے طاقت پکڑنے اور اسلامی سلطنتوں کے زوال پانے کے اسباب کے سمجھنے میں بڑی مدد دے گی''۔ (۲۳)

علامہ سید سلیمان ندوی سے محترم محمود خاں کی خط و کتابت تھی، محمود خاں صاحب اپنی کتابیں علامہ کو روانہ کرتے اور رائے طلب کرتے تھے، چنانچہ مذکورہ ریویو شائع ہونے سے پہلے محمود خاں صاحب نے اپنی تصنیف ارسال کی جس پر علامہ نے ۱۰/ اپریل ۱۹۳۴ء کو کتاب ملنے کی اطلاع دیتے ہوئے اپنی اجمالی رائے تحریر کی۔ خط کا متن یہ ہے:

"محترم! السلام علیکم ۱۰/ اپریل ۳۴ء

آپ کی کتاب آئی اور میری میز پر رکھی ہے، میں نے اسے جا بجا سے دیکھا اور آپ کی کاوشوں کا اندازہ کیا، کتاب اچھی لکھی گئی ہے، اس قسم کی کتاب کی سخت ضرورت تھی، آپ نے اس عہد کے نوجوان مسلمانوں کو ایک بڑے نازک عہد کی تاریخ سے روشناس کیا ہے، خدا جزائے خیر دے۔ سید سلیمان ندوی"۔ (۲۴)

علامہ سید سلیمان ندوی ۱۹۲۵ء میں مدراس کے جلسوں کے تمام ذمہ داروں کا بصمیم قلب شکریہ ادا کیا ہے اور انہیں تعلیمی قومی ہیرو قرار دیا ہے، (۲۵) ان میں مولانا یعقوب حسن سیٹھ، الحاج جمال محمد راوٴتر تاجر چرم، نواب سی۔ عبدالحکیم صاحب قومی و ملی خدمات میں شہرت یافتہ تھے اور مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کو حل کرنے میں پیش پیش رہتے تھے، علامہ نے یعقوب حسن کی ۲۵۶ صفحات پر مشتمل کتاب "کتاب الہدیٰ" پر مقدمہ تحریر فرمایا، وہ سیٹھ نواب غلام احمد کلامی (متوفی ۱۹۷۴ء) کے مخلص دوستوں میں تھے، ان دونوں نے مل کر جنوبی ہند میں تعلیمی بیداری اور اس کی ترقی و ترویج کے لیے کامیاب جدو جہد کی، کئی مقامات پر مدارس عربی، ہائی اسکول، کالج اور یتیم خانے قائم کیے۔ سیٹھ یعقوب حسن عالم و فاضل ہونے کے علاوہ "باریٹ لا" بھی تھے، قیام لندن کے دوران انہوں نے ایک ترکی دوشیزہ سے نکاح کیا تھا، فراغت تعلیم کے بعد سیٹھ صاحب نواب سی۔ عبدالحکیم (متوفی ۱۹۳۸ء) کے عملے میں شامل ہو گئے، چونکہ نواب صاحب سے سیٹھ صاحب کے دوستانہ مراسم تھے، اس لیے ان کو خصوصی درجہ دیا جاتا تھا مگر ایک مدت کے بعد انہوں نے اپنی خاص تجارت شروع کی، سیاست میں حصہ لیا، جیل بھی گئے، حوالات میں رہ کر "کشاف الہدیٰ" تصنیف کی جو ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی، (۲۶) دوسری تصنیف "کتاب الہدیٰ" پر علامہ نے نہ صرف بہترین مقدمہ لکھا بلکہ معارف ماہ دسمبر ۱۹۲۷ء میں اس پر اپنا گراں قدر تبصرہ بھی رقم کیا۔ تبصرہ ملاحظہ ہو:

"جناب سیٹھ یعقوب حسن صاحب نے "کتاب الہدیٰ" کے نام سے قرآن مجید کے متحد مضامین کو آیتوں کے حوالوں کے ساتھ یکجا کرنے کا جو کام شروع کیا تھا اور جس کا مقدمہ "کشاف الہدیٰ" کے نام سے پہلے شائع ہو چکا ہے، اسی کا پہلا (حصہ) اب شائع ہوا ہے، جس میں خدا کی تمام آیتوں کو یکجا کر کے ان کا ترجمہ اور ان کی شرح و تفسیر کی ہے، قدیم تفسیروں میں چونکہ ہر آیت کی الگ الگ تفسیر کی گئی ہے اس لیے ان سے دل پر ایک مضمون کی تمام آیتوں کا جو مجموعی اثر ہونا چاہیے تھا وہ نہیں پڑتا لیکن اس کتاب نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے، اس لیے جو لوگ قرآن مجید کے تمام مضامین و مطالب پر الگ الگ دفعتہً واحدۃً حاوی ہونا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب نہایت مفید ہے"۔ (۲۷)

علامہ سید سلیمان ندوی نے جنوبی ہند کا تیسرا سفر وسط ستمبر ۱۹۲۷ء میں کیا، جو نہ صرف ان کے لیے بہت کار آمد ثابت ہوا بلکہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے حق میں بھی یہ سفر ایک نعمت سے کم نہ تھا، اس سفر کی وجہ رئیس التجار جمال محمد راوٴتر (متوفی ۱۹۴۹ء) کی دعوت تھی جن سے گزشتہ ۱۹۲۵ء کے سفر مدراس میں تعلقات استوار ہوئے تھے، علامہ موصوف اپنے اس سفر کا مدعا بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"مدراس میں چند سال سے "مجلس العلما" نام ایک مجلس ہے جس کا صدر مقام ترچنا پلی ہے، اس کے ماتحت ایک مدرسہ ہے جس میں غریب مسلمان بچے اور یتیم اور نومسلم تعلیم پاتے ہیں، نصاب تعلیم میں قرآن پاک اور دینیات کے علاوہ اردو، ٹامل (ملکی زبان) اور انگریزی داخل ہے اور ساٹھ ستر ہزار کی اس کی خوبصورت عمارت ہے، ہزار بارہ سو ماہوار اس کا خرچ ہے، تبلیغ اور اشاعت تعلیم بھی اس کے فرائض میں ہیں، اس سال اس کی صدارت ایڈیٹر "معارف" کو عطا کی گئی، اس بنا پر مجھے ستمبر کے وسط میں مدراس جانا پڑا۔

اس سفر پر آمدگی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ کئی سال سے مدراس کے احباب سے "دارالعلوم ندوۃ العلما" کے دارالاقامہ کی تعمیر کے لیے مالی اعانت کا وعدہ چلا آتا تھا، امید تھی کہ شاید یہ موقع اس عہد کے ایفا کے لیے مناسب ہو، چنانچہ میں ۱۷ر ستمبر کی صبح کو ترچنا پلی پہنچا، اسی دن جلسہ کا آغاز تھا، مدراس کے ان علاقوں کی مادری زبان

"تامل" ہے، اردو یہاں کے مسلمان تک بھی برائے نام سمجھتے ہیں، جلسہ میں تمام تقریریں ٹامل میں ہوئیں، میرا خطبہ صدارت بھی جو گو اردو میں چھپا ہوا تھا، وہاں ٹامل میں ترجمہ ہو کر اور چھپ کر حاضرین میں تقسیم ہوا۔

جلسے میں علما کی تعداد بھی ساٹھ ستر ہزار کے قریب موجود تھی، مختلف تجویزیں منظور ہوئیں، خیر یہ سب کارروائیاں تو ہوتی ہیں، میرے نزدیک اصل چیز جو ہوئی وہ یہ ہے کہ رات کے وقت میری درخواست پر تمام علماء ایک ہال میں جمع ہوئے، عربی مدارس کی اصلاح وترقی اور اسلام کی موجودہ ضروریات اور علما کے موجودہ فرائض پر ایک وسیع ومبسوط تقریر ان کے سامنے کی گئی، جس سے وہ بے حد متاثر ہوئے اور مقرر کے خیالات سے انہوں نے اتفاق کیا اور ان ضروریات کے پورا کرنے اور ان اصطلاحات کے جاری کرنے پر پوری آمادگی ظاہر فرمائی۔(۲۹)

اس ضمن میں سب سے اہم کام یہ ہوا کہ میری کوشش سے نہیں بلکہ صرف خدا کے فضل اور بعض مخلص مسلمانوں کی ہمت سے جن میں سب سے پہلا نام ساہوکار جمال محمد صاحب کا ہے، دارالعلوم ندوۃ العلما کے دارالاقامہ کے لیے ستائیس ہزار کی رقم چندہ ہوئی جس میں اکیس ہزار وصول ہوگئے، اس طرح ارکان ندوۃ العلما کو بڑی فکر سے نجات ملی، اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے"۔(۳۰)

اس سفر میں علامہ موصوف نے شمالی آرکاٹ کے مختلف شہروں کا دورہ بھی کیا، ترچنا پلی سے نکل کر ۱۲/اکتوبر ۱۹۲۷ء کو میل وشارم پہنچے، جہاں ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا، علما و مشاہیر شہر کی کثیر تعداد ملاقات کا شرف حاصل کرنے حاضر ہوئی، انہوں نے وہاں کی "میل وشارم مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی" (قائم شدہ ۱۹۲۶ء) جس کے صدر نواب سی۔عبدالحکیم تھے، کے تحت جاری شدہ تعلیمی ورفاہی اداروں کا معائنہ فرمایا، خصوصاً مجلس صلاح دارین کا مدرسہ جو بعد کو ہائی اسکول کی شکل اختیار کر گیا، ان کی توجہ خاص کا مرکز رہا، چنانچہ انہوں نے مدرسہ کے تفصیلی معائنہ کے بعد "کتاب الرائے" میں اپنے تاثرات کا بایں الفاظ اظہار کیا:

"مجھ کو نہایت خوشی ہے کہ آج مدرسہ اسلامیہ میل وشارم کے دیکھنے کا اتفاق ہوا،

میرے ساتھ میرے دو کرم فرما ساہوکارسی - عبدالحکیم صاحب اور جمال محمد صاحب تھے، بعض درجوں کا امتحان لیا، یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ طلبا دینیات میں پوری طرح تیار تھے، میں نے دینیات اور سیرت کے سوالات پوچھے، طلبا نے سب کے جوابات ٹھیک دیے، اس مدرسہ میں اردو، انگریزی، عربی، حساب، جغرافیہ، نقاشی اور دینیات کی مجموعی تعلیم ہوتی ہے اور یہی وہ طریقہ ہے جو اس زمانے میں مسلمانوں کے لیے مفید ہوسکتا ہے، اردو کی نصابی کتابوں کے علاوہ دینیات اور سیرت کی کتابیں اردو ہی میں پڑھائی جارہی ہیں، قوم کو سی - عبدالحکیم صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے اپنے اہل وطن کے لیے ایسی عمدہ خدمت انجام دی ہے، اللہ تعالیٰ اس مدرسہ کو کامیاب فرمائے اور اس کے کارکنوں کو نیک توفیق عنایت فرمائے''۔(۳۱)

علامہ سید سلیمان ندوی ترچناپلی، بنگلور، آمبور ہوتے ہوئے شہر ویلور پہنچے تو انہوں نے اپنے میزبانوں سے ام المدارس مدرسہ باقیات صالحات (قائم شدہ ۱۸۶۲ء) کی زیارت اور وہاں کے صدر المدرسین شمس العلما علامہ شیخ عبدالجبار باقوی سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی، ان کے ہمراہ جمال محمد راؤتر تھے، وہ ان کو مدرسہ باقیات لے آئے، انہوں نے وہاں کی مسجد اور عمارتوں کا معائنہ فرمایا جس کا تذکرہ علامہ نے معارف ماہ نومبر ۱۹۲۷ء کے شمارے میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''یہ (مدرسہ باقیات صالحات) مدراس کا سب سے بڑا مدرسہ ہے، مولانا عبدالوہاب صاحب مرحوم نے اس کی بنیاد ڈالی تھی، عمارت بھی نہایت شاندار ہے، درس گاہیں اور لڑکوں اور مدرسین کے رہنے کے کمرے بھی بلند و مستحکم ہیں، مسجد بھی عظیم الشان ہے''۔(۳۲)

علامہ شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء) سے شمس العلما عبدالجبار صاحب کے علمی روابط تھے، علامہ شبلی کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامہ ''الندوہ'' میں کسی نے کتاب ''ملاحسن'' پر اعتراض کرتے ہوئے مضمون لکھا جس کا مدلل جواب انہوں نے دیا، علامہ شبلی ان کی تحریر سے بہت متاثر ہوئے اور دارالعلوم ندوۃ العلما میں اسّی روپے مشاہرے پر منصب صدر المدرسین کی پیشکش کی جس کے لیے انہوں نے اپنے شیخ سے بُعد مکانی کا عذر کرتے ہوئے معذرت خواہی کی، (۳۳) علامہ شبلی کی طرح

علامہ سید سلیمان ندوی کے بھی شمس العلما عبدالجبار صاحب سے تعلقات تھے، یہی وجہ تھی کہ علامہ موصوف ان سے ملاقات کے متمنی تھے مگر افسوس وقت کی تنگ دامنی نے اس کی اجازت نہیں دی، اس واقعہ کو شمس العلما عبدالجبار صاحب کے شاگرد رشید مولانا شرف الدین خاں باقوی، کورگ کرناٹکا (متوفی ۱۹۷۷ء) ابن قاضی عبدالغفور خاں (متوفی ۱۹۴۳ء) نے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ایک مرتبہ (ماہ اکتوبر ۱۹۲۷ء) حضرت سید سلیمان ندوی صاحب عالی جناب جمال محمد راوٴتر (متوفی ۱۹۴۹ء) کے ساتھ کار میں مدراس جاتے ہوئے ڈیڑھ بجے دارالعلوم تشریف لائے، درس و تدریس کا وقت نہیں تھا، طلبا اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے، میں اور مولوی علیم اللہ صاحب مدراسی جو درجہ فاضل میں تھے، نئی عمارت کے آخری کمرے میں آرام کر رہے تھے، سیدھے کمرے کے پاس پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا، ہم باہر آئے تو مولانا نے دریافت کیا کہ ''حضرت مولانا عبدالجبار صاحب قبلہ'' کہاں رہتے ہیں، ہم نے جواب میں کہا کہ آپ دوپہر ۴ بجے تشریف لاتے ہیں، تو مولانا نے فرمایا کہ آپ لوگ مولانا سے کہہ دیں کہ ''سلیمان ندوی صرف آپ کی ملاقات کا شرف حاصل کرنے آیا تھا''، ہم نے جب آپ کا اسم گرامی سنا تو پریشان ہوگئے، منت سماجت کی کہ ذرا توقف کریں، ہم صدر مدرسین صاحب قبلہ کو اطلاع دیتے ہیں، آپ نے معذرت چاہی اور کہا کہ ''آج مدراس میں تین بجے پروگرام ہے، زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتا'' اور عازم مدراس ہوگئے، جب حضرت قبلہ کو اس کا علم ہوا تو ہم پر سخت برہم ہوگئے کہ اطلاع کیوں نہیں دی''۔(۳۴)

مدرسہ باقیات صالحات ویلور کے مہتمم اور دارالعلوم ندوۃ العلما کے رکن رکین خان بہادر علامہ ضیاء الدین محمد فاضل مدرسہ صولتیہ، مکہ مکرمہ (متوفی ۱۹۴۱ء) کا بیان ہے کہ شمس العلما مولانا شیخ عبدالجبار صاحب (متوفی ۱۹۳۴ء) نے انگریزی حکومت کی طرف سے عزت افزائی کے باوجود اپنے شیخ بانی مدرسہ باقیات شاہ عبدالوہاب قادری (متوفی ۱۹۱۹ء) کی طرح ردعیسائیت کے سلسلہ میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے۔(۳۵) (باقی)

نصابِ زکوٰۃ: ایک غور طلب مسئلہ

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا کہ ''وہاں کے لوگوں کو یہ دعوت دینا کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے اور میں اللہ کا رسول ہوں، پھر اگر وہ اس بات کو مان لیں تو ان کو بتانا کہ اللہ نے ہر رات دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں، پھر اگر وہ یہ بھی مان لیں تو ان کو بتانا کہ اللہ نے ان پر مال کا صدقہ (زکوٰۃ) فرض کیا ہے جو ان کے مالداروں سے لیا جائے گا اور انہیں میں کے مفلسوں کو دیا جائے گا''۔ (صحیح بخاری، جلد ا، حدیث: ۱۳۱۳)

اس حدیث میں صدقہ سے مراد زکوٰۃ ہے جو اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے تیسرا رکن ہے، اور نماز کے ساتھ ہی قرآن میں بار بار زکوٰۃ کا ذکر آیا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ نماز ہر عاقل، بالغ، آزاد، امیر، غریب، مرد عورت پر فرض ہے اور زکوٰۃ صرف مالداروں پر فرض ہے، زکوٰۃ کے بہت سے مسائل ہیں جو فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں، یہاں ایک بنیادی مسئلے کی طرف علما و مفتیان کرام کی توجہ منعطف کرانا مقصود ہے کہ دورِ حاضر میں زکوٰۃ کا نصاب کیسے اور کیا متعین کیا جائے؟

مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی مایہ ناز کتاب ''معارف الحدیث'' جلد چہارم کی کتاب الزکوٰۃ میں ایک حدیث کا ترجمہ و تشریح یوں درج ہے:

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ پانچ وسق سے کم کھجوروں پر زکوٰۃ نہیں ہے اور پانچ اوقیہ سے کم چاندی میں زکوٰۃ نہیں ہے اور پانچ راس اونٹوں سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ (صحیح بخاری و مسلم)

نعمانی منزل نزد ابوہریرہ مسجد، ۴/۴۰۷، جے۔۲۴، ہمدرد نگر۔بی، جمال پور، علی گڑھ۔ موبائل: ۷۷۷۰۸۲۷۹۸۹۷۔

عہد نبویؐ میں خاص کر مدینہ طیبہ کے قرب وجوار میں جو لوگ خوش حال اور دولت مند ہوتے تھے، ان کے پاس دولت زیادہ تر ان تین جنسوں میں سے کسی جنس کی صورت میں ہوتی تھی، یا تو ان کے باغوں کی پیداوار کھجوروں کی شکل میں، یا چاندی کی شکل میں یا اونٹوں کی شکل میں، رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں ان تینوں جنسوں کا نصابِ زکوٰۃ بیان فرمایا ہے یعنی ان چیزوں کی کم سے کم مقدار پر زکوٰۃ واجب ہوگی، کھجوروں کے بارے میں آپ ﷺ نے بتایا کہ پانچ وسق سے کم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، ایک وسق قریباً چھ من کا ہوتا ہے، اس حساب سے پانچ وسق کھجوریں تیس من کے قریب ہوں گی اور چاندی کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ پانچ اوقیہ سے کم میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، ایک اوقیہ چاندی چالیس درہم کے برابر ہوتی ہے، اس بنا پر پانچ اوقیہ چاندی دو سو درہم کے برابر ہوگی جس کا وزن مشہور قول کی بنا پر ساڑھے باون تولہ (یا ۶۱۲ گرام) ہوتا ہے اور اونٹوں کے بارے میں آپ ﷺ نے بتایا کہ پانچ راسوں سے کم میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

اس حدیث میں صرف ان ہی تین جنسوں میں زکوٰۃ واجب ہونے کا کم سے کم نصاب بیان فرمایا گیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ پانچ وسق (تیس من) کھجوریں ایک مختصر گھرانے کے سال بھر کے گزارے کے لیے کافی ہو جاتی تھیں، اسی طرح دو سو درہم میں سال بھر کا خرچ چل سکتا تھا، اس لیے اس مقدار کے مالک کو خوش حال اور صاحب مال قرار دے کر زکوٰۃ واجب کر دی گئی۔ (معارف الحدیث، ج ۴، ص ۳۵-۳۶)

صاحب معارف الحدیث نے ص ۳۶ کے زیریں حصے میں ایک حاشیہ بھی لکھا ہے جو درج ذیل ہے:

> ”حضرات علمائے کرام کے لیے یہ مسئلہ قابل غور ہے کہ اب جب کہ ان تینوں نصابوں کی مالیت میں بہت بڑا فرق ہو گیا ہے اور سونے چاندی کی قیمت میں بھی بہت بڑا فرق ہے اور قریباً دنیا کے سب ملکوں میں سکہ کاغذی نوٹوں کی شکل میں ہے اور حکومتیں اپنے سکوں کی قیمت میں مختلف عوامل کے تحت کمی بیشی کرتی رہتی ہیں تو ان حالات میں وجوب زکوٰۃ کا کم سے کم نصاب کس اصول پر متعین کیا جائے؟“
>
> (معارف الحدیث ۴، ص ۳۶)

مولانا نعمانی مرحوم کا یہ فٹ نوٹ شاہ ولی اللہؒ کے اسی قول کی بنیاد پر ہے جس کا ذکر بغیر کسی

حوالے کے حدیث کی تشریح کے آخر میں کیا گیا ہے۔

شاہ ولی اللہ کا یہ اقتباس ان کی شاہکار تصنیف ''حجۃ اللہ البالغۃ'' سے ماخوذ ہے، حجۃ اللہ البالغۃ کی اصل عربی عبارت جو مقادیر الزکوٰۃ کے عنوان کے تحت مسطور ہے، یہ ہے:

قال النبی ﷺ: لیس فیما دون خمسة اوسق من التمر صدقة و لیس فیما دون خمس اورق من الورق صدقة، ولیس فیما دون خمس ذود من الابل صدقة۔ اقول: انما قدر من الحب والتمر خمسة اوسق، لانها تکفی أقل اهل بیت الی سنة؛ وذلك لان اقل البیت: الزوج والزوجة وثالث خادم أو ولد بینهما .... وغالب قوت الانسان رطل اومد من الطعام، فاذا اکل کل واحد من هؤلاء ذلك المقدار کفاهم لسنة، وبقیت بقیة لنوائبهم اوادامهم. وانما قدر من الورق خمس اواق، لانها مقدار تکفی اقل اهل بیت سنة کاملة، اذا کانت الاسعار موافقة فی اکثر الاقطار ....

(رحمۃ اللہ الواسعۃ شرح حجۃ اللہ البالغۃ، ج ۴، ۵۴)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: پانچ وسق سے کم کھجوروں میں زکوٰۃ نہیں ہے، اور پانچ اوقیہ سے کم چاندی میں زکوٰۃ نہیں ہے اور پانچ راس اونٹوں سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے''۔ یہ حدیث نقل کرنے کے بعد شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں کہ نبی کریم ﷺ نے غلہ اور کھجوروں کا پانچ وسق سے اندازہ صرف اس لیے مقرر کیا کہ پانچ وسق ایک چھوٹے خاندان کے لیے ایک سال تک کافی ہوجاتے ہیں اور چھوٹے خاندان سے مراد شوہر، بیوی اور تیسرا کوئی خادم یا ان دونوں کے درمیان کوئی بچہ ہوتا ہے اور انسان کی عام خوراک ایک رطل یا ایک مد ہوتی ہے تو جب ان میں سے ہر ایک اتنی مقدار کھائے گا تو وہ (پانچ وسق) ان کے لیے ایک سال تک کافی ہوں گے اور کچھ ان کے سالن اور ہنگامی ضروریات کے لیے بھی بچ جائے گا اور چاندی کے پانچ اوقیہ حضور ﷺ نے اس لیے تجویز فرمائے کہ وہ ایک ایسی مقدار ہے جو نرخ کے موافق ہونے کی صورت میں اکثر ملکوں میں ایک چھوٹے خاندان کے لیے پورے ایک سال تک کافی ہوتی ہے......۔

مندرجہ بالا حدیث میں چاندی کے نصاب کی یہ تصریح کی گئی ہے کہ وہ دوسو درہم (۵۲ ½

تولہ یا ۶۱۲ گرام) ہے۔

پھر چند سطروں کے بعد شاہ ولی اللہؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ:

والذهب محمول على الفضة، و كان فى ذلك الزمان صرف دينار بعشرة دراهم، فصار نصابه عشرين مثقالاً۔ (رحمة الله الواسعة شرح حجة الله البالغة، ج ۴، ص ۶۱)

سونا چاندی پر محمول ہے اور اس زمانے (دور رسالت و خلافت) میں ایک دینار کی تبدیلی (ایکسچینج) دس درہم کے ساتھ ہوتی تھی، لہٰذا سونے کا نصاب بیس دینار (بیس مثقال یا (۷ ½ تولہ ۸۷ ½ گرام) ہوا۔

حجۃ اللہ البالغۃ کے شارح ''رحمۃ اللہ الواسعۃ'' کے مصنف نے سونے کے نصاب کے بارے میں ابوداؤد، ابن ماجہ اور نصب الرایہ کے حوالے سے متعدد روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مذکورہ تمام روایات گو الگ الگ ضعیف ہیں مگر ان کا ضعف شدید نہیں ہے، پھر سب مل کر ایک قوت حاصل کر لیتی ہیں اور قابل استدلال ہو جاتی ہیں۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ، ج ۴، ص ۶۰)

اگلے صفحے پر شارح مرحوم نے ابن قدامہ کی کتاب المغنی سے یہ اقتباس درج کیا ہے:

جمہور فقہاء کا قول ہے کہ: سونے کا نصاب بیس مثقال (۷ ½ تولہ ۸۷ ½ گرام) ہے۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ، ج ۴، ص ۶۰)

''فقہ السنہ'' کے مصنف محمد عاصم الحداد نے لکھا ہے:

''جمہور (اکثریت سلف) کے نزدیک سونے کا نصاب بیس دینار (بیس مثقال (۷ ½ تولہ ۸۷ ½ گرام) ہے اور شرح زکوٰۃ ۲ ½٪ (چالیسواں حصہ ہے، یعنی کسی کے پاس (۷ ½ تولہ ۸۷ ½ گرام) سونا ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے تو اس پر اس کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے''۔ (فقہ السنہ، ص ۳۰۱)

پھر مصنف نے ابوداؤد، ابوعبید اور ابن ماجہ کے حوالے سے بیس دینار (بیس مثقال) سونے کے نصاب زکوٰۃ ہونے پر دلالت کرنے والی متعدد روایات نقل کی ہیں اور آخر میں نیل الاوطار کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''سونے کے نصاب سے متعلق یہ سب روایات سند کے لحاظ سے ضعیف ہیں

لیکن جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، جمہور کا مسلک ان ہی کے مطابق ہے''۔

(فقہ السنہ، ص ۳۰۱)

امام دار الہجرت حضرت امام مالک بن انسؒ کی کتاب ''مؤطا'' کے متعلق امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ ''اصح الکتب بعد کتاب اللہ مؤطا مالك'' (قرآن مجید کے بعد صحیح ترین کتاب مؤطا امام مالکؒ ہے)۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ، شرح حجۃ اللہ البالغۃ، ج ۲، ص ۴۹۹)

اسی مؤطا امام مالک میں امامؒ کا قول ہے:

السنة التی لا اختلاف فیها عندنا: ان الزکوٰة تجب فی عشرین دیناراً کما تجب فی مأتَی درهم (موطا، ص ۲۵۰)	ہمارے نزدیک وہی سنت ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سونے کے بیس دینار پر زکوٰۃ واجب ہے جس طرح چاندی کے دوسو درہم پر واجب ہوتی ہے۔

ذیل میں عصر حاضر کے معروف فقیہ علامہ یوسف القرضاوی حفظہ اللہ کا ایک فتویٰ نقل کیا جارہا ہے، جو مسئلۂ زیر بحث سے تعلق رکھتا ہے:

''سوال: روپے کی زکوٰۃ کا حساب سونے سے لگایا جائے یا چاندی سے؟

جواب: بہتر اور قرین قیاس یہی ہے کہ زکوٰۃ کا حساب سونے سے لگایا جائے نہ کہ چاندی سے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زکوٰۃ کا نصاب سونے اور چاندی دونوں سے مقرر کیا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ دو نصاب مقرر کیے جائیں، ایک چاندی کا اور دوسرا سونے کا، بلکہ حقیقتاً وہ ایک ہی نصاب تھا، چاہے سونے کا ہو چاہے چاندی کا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سونے کا نصاب بیس دینار اور چاندی کا نصاب دوسو درہم مقرر کیا تھا، اس زمانے میں ایک دینار دس درہم کے برابر ہوا کرتا تھا، گویا بیس دینار اور دوسو درہم قیمت میں مساوی تھے، اس کے بعد سونے کے مقابلے میں چاندی کی قیمت مسلسل گرتی گئی اور آج یہ حالت ہے کہ سونے اور چاندی کی قیمتوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

(پھر) اسلام میں زکوٰۃ امیروں (مالداروں) پر فرض کی گئی ہے تا کہ ان کا کچھ

مال فقیروں (غریبوں) کی طرف لوٹا دیا جائے، اس دور میں چاندی کی قیمت اس قدر گر گئی ہے کہ دوسو درہم چاندی رکھنے والے کو ہم امیر (مالدار) نہیں کہہ سکتے کیونکہ دوسو درہم کے برابر چاندی زیادہ سے زیادہ چار پانچ سو روپے کے برابر ہوگی اور چار پانسو روپے کی ملکیت کسی شمار میں نہیں ہے، اس کے برخلاف بیس دینار کے برابر سونا جو تقریباً ساڑھے سات تولہ ہوتا ہے، اس کی قیمت تیس ہزار روپے سے زیادہ ہوتی ہے۔(۱)

اگر روپے پیسے کے علاوہ ہم ایک نظر ان دوسری چیزوں پر ڈالیں جن پر زکوٰۃ واجب ہے، مثلاً اونٹ، بکری وغیرہ، تو ہمارا دل اسی بات پر مطمئن ہوگا کہ سونے ہی کو روپے پیسے کا نصاب مقرر کرنا چاہیے، کیونکہ اونٹ اور بکری وغیرہ کی جو تعداد نصاب زکوٰۃ کے لیے مقرر کی گئی ہے، اس کی قیمت ساڑھے سات تولے سونے کے آس پاس تو ہوسکتی ہے لیکن دوسو درہم چاندی کے آس پاس ہرگز نہیں ہوسکتی"۔ (فتاویٰ یوسف القرضاوی، ج ا، ص ۱۳۹)

مسطورۂ بالا عبارات و اقتباسات اور حدیث و روایات کو غور سے پڑھنے کے بعد مندرجہ ذیل نکات واضح ہوتے ہیں:

۱۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرمانے کے مطابق: زکوٰۃ اغنیا (مالداروں) سے لی جائے گی اور فقرا (غریبوں) کو دی جائے گی۔

۲۔ مالدار (غنی) ہونے کا معیار نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ مقرر فرمایا ہے کہ جس کے پاس دوسو درہم (چاندی) یا بیس دینار (سونا) ہو وہ غنی (مالدار) ہے اور اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔

۳۔ اس زمانے (عہد رسالت) میں دوسو درہم (۵۲ ۱/۲ تولہ یا ۶۱۲ گرام) چاندی کی قیمت وہی ہوا کرتی تھی جو بیس دینار (۷ ۱/۲ تولہ ۸۷ ۱/۲ گرام) سونے کی ہوا کرتی تھی۔

---

(۱) یہ اس وقت کی قیمت ہے جب علامہ قرضاوی نے یہ فتویٰ لکھا تھا۔ آج ۸/اپریل ۲۰۲۰ء کو ۵۲ ۱/۲ تولے (۶۱۲ گرام) چاندی کی قیمت کم و بیش ۲۵ ہزار ہے، جب کہ ۷ ۱/۲ تولہ (۸۷ ۱/۲ گرام) سونے کی قیمت ۳ ۱/۲ لاکھ سے زیادہ ہے۔

۴۔شاہ ولی اللہ کی تحقیق کے مطابق سونے چاندی کی مذکورہ قیمت اتنی ہوتی تھی کہ ایک چھوٹے خاندان کے ایک سال کے اخراجات کے لیے کافی ہوتی تھی (بالکل اسی طرح جس طرح پانچ وسق کھجوروں یا پانچ راس اونٹوں کی قیمت ایک چھوٹے خاندان کی سال بھر کی ضروریات کے لیے کافی ہوتی تھیں۔)

۵۔عہد رواں میں ساڑھے باون (۵۲½) تولہ چاندی کی قیمت تین چار افراد کے ایک چھوٹے سے خاندان کے ایک سال تو کجا تین ماہ کے اخراجات کے لیے بھی بہت مشکل سے کافی ہوگی، اس صورت میں ۵۲½ تولے چاندی یا اس کی قیمت کے مالک کو کسی طرح بھی غنی (مالدار) نہیں کہا جاسکتا، نہ اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔

۶۔معلوم ہوا کہ چاندی کی قیمت کا اب کوئی اعتبار نہیں رہ گیا ہے، کیونکہ ۵۲½ تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا مالک تو بیچارہ اب خود فقرا (غربا) کی صف میں آگیا ہے، اس کو زبردستی غنی (مالدار) مان کر اس پر زکوٰۃ فرض کرنا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ''خذ من أغنیاءھم و ترد إلی فقراءھم'' کی خلاف ورزی اور قرآن پاک میں ''اطیعوا الرسول'' کا جو حکم بار بار دیا گیا ہے اس کے ماننے سے عملی انکار کے مترادف ہوگا۔

۷۔اب فرضیت زکوٰۃ کا صحیح نصاب یہی قرار پائے گا کہ سونے کی قیمت سے حساب لگایا جائے، یعنی جس کے پاس ۷½ تولہ (۸۷½ گرام) سونا یا اس کی قیمت کے برابر نقدی ہوگی وہی صاحب نصاب اور زکوٰۃ ادا کرنے کا مکلف ہوگا۔

مآخذ و مراجع

(۱) صحیح بخاری، جلد اول، نئی دہلی، ب ت۔ (۲) موطا امام مالک، ممبئی ب ت۔ (۳) معارف الحدیث چہارم، محمد منظور نعمانی لکھنؤ، ۱۹۶۷ء۔ (۴) رحمۃ اللہ الواسعہ، شرح حجۃ اللہ البالغۃ، چہار، مفتی سعید احمد پالن پوری، دیوبند، ۲۰۰۳ء۔ (۵) فقہ السنۃ، محمد عاصم الحداد، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء۔ (۶) فتاویٰ یوسف القرضاوی، جلد اول، نئی دہلی ۱۹۹۹ء۔

ملا عبد العلی لکھنوی ''ملک العلماء'' و''بحر العلوم''

(۱۱۴۲ھ/ ۱۷۲۹ء - ۱۲؍ رجب ۱۲۲۵ھ/ ۱۳؍ اگست ۱۸۱۰ء)

ڈاکٹر ریاض احمد ریاضی بن عبد الباری

نام ونسب: نام عبد العلی محمد اور (۱) کنیت ابوالعباس ہے۔(۲) ملا نظام الدین جو کہ استاد الہند (۳) کے نام سے مشہور ہیں ان کے لخت جگر اور قرۃ عین ہیں۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: ملا عبد العلی محمد ابوالعباس بن ملا نظام الدین بن ملا قطب الدین شہید سہالوی۔(۴) سلسلۂ نسب مشہور صحابی و میزبان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابوایوب انصاری خزرجی مدنی تک پہنچتا ہے۔(۵)

ان کا شمار خانوادۂ فرنگی محل کے کبار علماء میں ہوتا ہے۔ یہ خانوادہ غالباً دنیا کا تنہا خاندان ہے جس میں کم از کم ایک ہزار سال سے زائد نہ صرف پڑھے لکھے لوگ بلکہ نابغۂ روزگار علماء پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے مختلف زبانوں میں اہم علمی خدمات انجام دیں۔ اس خاندان کے جد اعلیٰ عبد اللہ انصاری ایک زبردست عالم، صوفی، شاعر، اور نثار تھے۔ علمی و مذہبی دنیا میں وہ شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔ ان کا انتقال ۲۲ ذوالحجہ سنہ ۴۸۱ھ مطابق ۸ مارچ سنہ ۱۰۸۹ء کو ہوا۔ ان کا شمار افغانستان کی محترم شخصیات اور فارسی ادب کے بہترین اہل قلم میں ہوتا ہے۔(۶)

شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری ۳۸۶ھ مطابق ۱۰۰۶ء میں ہرات میں پیدا ہوئے اور اس وقت سے اب تک ہندوستان کے علاوہ ان کی نسل کے لوگ ہرات میں موجود ہیں۔ ویسے تو انصاریانِ ہرات کا ہجرت کر کے ہندوستان آنا التمش کے عہد سے شروع ہوتا ہے، لیکن نویں صدی ہجری یعنی پندرہویں صدی عیسوی کے اواخر میں جب تیموری لشکر وسط ایشیا، ترکی، ایران اور خراسان وغیرہ ممالک کو تاراج کر رہا تھا اسی تاریک دور میں انصاریان ہرات کے کچھ افراد کو دوبارہ ہجرت کر کے ہندوستان آنا پڑا

اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ۔

اوران مہاجروں میں علاء الدین انصاری ہروی بھی شامل تھے جو علمائے فرنگی محل کے ہندوستان آنے والے اجداد میں پہلے شخص ہیں اور جن کا عبداللہ انصاری ہروی تک سلسلۂ نسب اس طور سے ہے: علاء الدین بن اسماعیل بن اسحاق بن داؤد بن عزیز الدین بن جمال الدین بن دوست محمد بن غیاث الدین بن معزالدین بن حبیب اللہ بن شمس الدین بن جلال الدین بن ظہیر الدین بن سلطان محمد بن نظام الدین بن شہاب الدین محمود بن عوض بن ایوب بن جابر بن عبداللہ انصاری۔(۷)

یہ خاندان موجودہ بارہ بنکی ضلع کے قصبہ ''سہالی'' ہوتے ہوئے لکھنؤ آیا۔اسی خاندان میں مشہور زمانہ عالم ملا قطب الدین شہید سہالوی پیدا ہوئے جن کے بارے میں غلام علی آزاد بلگرامی رقمطراز ہیں: ''ملا قطب الدین شہید امام اساتذہ ومقتدائے جہاندہ است،معدن عقلیات ومخزن نقلیات ......ملا قطب الدین عمرہا انجمن درس آراست وجہاں جہاں ارباب تحصیل را بپایۂ تکمیل رساندن امروز سلسلۂ استفادہ اکثر علماء کشور ہندوستان بہ او منتہی می شود''۔(۸)

یہی ملا قطب الدین شہید خانوادۂ علمائے فرنگی محل کے جد امجد ہیں، ان کے چار بیٹوں اور ان کی اولاد نے مشعل علم کو اس طرح روشن کیا کہ آٹھ پشتوں تک سارے ہندوستان میں اس کی روشنی پھیلتی رہی اور ہر نسل میں ایک سے زیادہ ایسے عالم ہوتے رہے جنھیں بجا طور پر نابغۂ روزگار کہا جا سکتا ہے اور جن کے علم کی روشنی نے نہ صرف ہندوستان کو بلکہ اسلامی دنیا کے دوسرے حصوں کو بھی منور کیا، اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔اگرچہ علم کی نوعیت بہت حد تک بدل چکی ہے۔

ملا قطب الدین کی شہادت ۱۹ رجب سنہ ۱۱۰۳ھ مطابق ۲۷ مارچ سنہ ۱۶۹۲ء کے بعد شہنشاہ عالمگیر کے حکم سے ملائے شہید کی اولاد کے قیام کے لیے ان کے دونوں بڑے بیٹوں کو لکھنؤ میں احاطۂ چراغ بیگ میں ایک تیل اور گھوڑوں کے یورپین تاجر کی چھوڑی ہوئی خالی عمارت جو فرنگی محل کے نام سے مشہور تھی، دے دی گئی۔سنہ ۱۶۹۴ء میں ملا سعید اپنے چھوٹے بھائیوں ملا نظام الدین اور ملا رضا نیز دیگر افراد خاندان کو اس فرنگی کے محل میں آباد کر کے حیدر آباد چلے گئے اور تمام افراد خاندان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اس کم عمر ۱۶ سالہ نوجوان کے سر آپڑی جو آئندہ استاد الہند ملا نظام الدین کے نام سے مشہور ہوا اور جس نے عربی اور فارسی کی تعلیم کے لیے وہ درس ترتیب دیا جو آج بھی بیشتر عربی وفارسی مدارس میں رائج ہے اور جس نے اس ادارے کی بنیاد ڈالی جس کی بدولت سیکڑوں سے زیادہ عربی وفارسی

نیز اردو تصانیف وجود میں آئیں۔

ملا نظام الدین (۱۰۸۹ھ-۱۱۶۱ھ) نے اپنے والد نیز دیگر علماء مثلاً ملا امان اللہ بنارسی، ملا علی قلی جائسی وغیرہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کے بعد ملا غلام نقش بند لکھنوی سے فاتحہ فراغ پڑھا اور پچیس سال کی عمر میں تحصیل علم سے فراغت کے بعد مسند درس آراستہ کی، اور اپنے چھوٹے بھائی ملا رضا اور بڑے بھائی ملا سعید کے بیٹوں ملا احمد عبدالحیٔ (وفات سنہ ۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۴ء) اور ملا عبدالعزیز (وفات ۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۲ء) کے ساتھ اس علمی ادارے کو وجود میں لائے جو ان کی فرنگی کے محل میں سکونت کی وجہ سے ''فرنگی محل'' کے نام سے مشہور ہوا اور جس میں اس وقت تک تین سو سے زیادہ حضرات گذر چکے ہیں جن میں شاید ہی کوئی کم علم رہا ہو۔ یہ علماء بنیادی طور سے صاحب درس تھے اس لیے ان کی بیشتر تالیفات کا تعلق بھی درس ہی سے ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کی تالیفات میں شرحوں اور حاشیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ محض حواشی ہیں۔ حقیقتاً وہ بلند پایہ مستقل تصانیف کا مرتبہ رکھتی ہیں۔

ملا نظام الدین کے عہد میں پہلی مرتبہ اسلامی مدارس کے لیے متفقہ درس ترتیب دینے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے درس میں منقولات پر زیادہ زور دیا جبکہ ملا نظام الدین نے اپنے ترتیب دادہ درس نظامی میں منقولات و معقولات دونوں پر یکساں زور دیا تھا۔ ملا نظام الدین کے ترتیب کردہ اس درس نے پورے ملک میں شرف قبولیت حاصل کی اور آج تک زیادہ تر مدارس میں اسی کے مطابق تعلیم دی جارہی ہے۔ ملا نظام الدین کو بحیثیت استاد اپنی زندگی ہی میں وہ مرتبہ حاصل ہو گیا تھا کہ اکناف و اطراف ملک سے نہ صرف طالبان علم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے بلکہ دوسرے اساتذہ کے طلبہ بھی فاتحۂ فراغ کے لیے ملا نظام الدین ہی کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

ایک ماہر استاد ہونے کے علاوہ ملا نظام الدین متعدد اہم کتابوں کے مصنف بھی ہیں جن میں شرح مسلم الثبوت، شرح تحریر الاصول، صبح صادق، منار الاصول، حاشیہ شرح عقائد جلالی، حاشیہ حواشی قدیمہ دوانیہ، حاشیہ صدرا، حاشیہ شمس بازغہ، شرح رسالہ مبارزیہ، مناقب رزاقیہ اور رسالہ دربیان وضو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شامل ہیں۔(۹)

ملا نظام الدین نے جس شمع کو روشن کیا تھا اسی کی روشنی نے آئندہ نسل میں پورے ہندوستان کو جگمگا دیا۔ اسی نسل کے مشہور علما میں ''ملک العلماء''، ''بحر العلوم'' ملا عبد العلی محمد بھی ہیں۔

ولادت و پرورش: ملا عبد العلی محمد کے والد ماجد ملا نظام الدین نے دو شادیاں کی تھیں جس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تو لوگوں نے مشورہ دینا شروع کیا کہ دوسری شادی کر لیں، فرمانے لگے کہ میں اس بکھیڑے میں نہیں پڑنا چاہتا، ہاں اگر کسی بزرگ کا ارشاد ہوگا تو مجبوری ہے، میر اسماعیل بلگرامی سے ملا صاحب نے فیض حاصل کیا تھا انھوں نے کہلا بھیجا کہ مجھ کو الہام سے معلوم ہوا ہے کہ دوسری شادی سے تمھارے اولاد ہوگی، غرض اخیر عمر میں قصبہ سترکھ (بارہ بنکی) میں شادی کی جس سے وہ گوہر شاہوار پیدا ہوا جو آج ''ملک العلماء'' اور ''بحر العلوم'' کے نام سے مشہور ہے۔ (۱۰)

ملا عبد العلی بحر العلوم کی ولادت سنہ ۱۱۴۲ھ (۱۱) مطابق سنہ ۱۷۲۹ء (۱۲) میں ہوئی۔ جملہ کتب درسیہ و علوم متعارفہ اپنے والد ماجد سے پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر سترہ (۱۳) یا اٹھارہ (۱۴) سال کی تھی۔ ۹ جمادی الاولی سنہ ۱۱۶۱ھ مطابق ۲۹/ اپریل سنہ ۱۷۴۸ء میں والد ماجد کے انتقال (۱۵) کے بعد معقولات و منقولات کی کتابوں کے مطالعہ میں مشغول ہو گئے، (۱۶) یہ اور بات ہے کہ ان کا خصوصی رجحان معقولات کی طرف تھا، (۱۷) والد ماجد کے انتقال کے بعد انہوں نے ملا کمال الدین سے استفادہ کیا جو کہ ملا نظام الدین کے شاگردوں میں سب سے ممتاز تھے۔ مشکل، پیچیدہ اور غامض مسائل کے حل کے لیے ان ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ رحمان علی صاحب اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں کہ: ''بعد وفات پدر بمطالعہ کتب معقول و منقول مشغول گشت و مطالب غامضہ بخدمت ملا کمال الدین کہ تلمیذ خاص پدرش بود پیش می کرد''۔ (۱۸)

انہوں نے ملا کمال الدین کی خدمت میں مباحثہ شروع کیا اور علم کی ترقی میں مصروف ہوئے۔ خود فرماتے تھے کہ مولانا کمال الدین کے پاس جا کر میں کسی مسئلہ پر بحث شروع کرتا اور کمال جسارت سے بے تکلفانہ مباحثہ کرتا، ملا کمال الدین ناخوش نہ ہوتے اور نہایت توجہ سے نکات و مشکلات مسائل حل فرماتے جس سے میرا علم یوماً فیوماً بڑھتا گیا، لوگ ملا کمال الدین سے کہتے کہ اس قدر ان صاحبزادے کی رعایت مناسب نہیں ہے مگر ملا کمال الدین صاحب فرماتے کہ میرے مخدوم زادے ہیں جو کچھ مجھ کو آیا ہے انھیں کے والد سے ملا ہے۔ یہ صاحبزادے اس سن اور عمر میں کلام قدما و متأخرین سے جس قدر

واقف ہیں ان کے والد بھی اس سن اور عمر میں اس قدر واقف نہ ہوں گے۔(۱۹)

اغصان اربعہ کے مصنف لکھتے ہیں: ''وبراقم رسیدہ است کہ مردم از ملا کمال الدین گفتند کہ ایں طفل ایں قدر بحث وتکرار بخدمت می نماید وبے ادبانہ کلام میکند وشما پاسداری ودلجوئی اومی فرمایند ......سیوم آنکہ دریں عرصہ قلیل مطالعہ کتب قدماء ونظر برتصانیف متأخرین آنچہ کہ اینکس رامیسر گشت بعلماء درتمام عمر حاصل نمی شود''۔(۲۰)

ملا کمال الدین سے تکمیل علم کے بعد فاضل بے نظیر، جامع منقولات ومعقولات عالم ہوئے (۲۱)،صحیح معنوں میں لفظاً ومعناً ''بحر العلوم''، یعنی علم کے سمندر تھے،ایک مدت تک ان کا فیض علم لکھنؤ میں جاری رہا لیکن اسے شوئ قسمت کہیے کہ ایک مذہبی ومسلکی قضیہ ومسئلہ درپیش ہوا جس کی وجہ سے جان کے خوف سے وطن کو خیر باد کہنا پڑا اور پھر شاہجہاں پور، رامپور، بوہار (ضلع بردوان) کی خاک چھانتے ہوئے ارکاٹ اور مدراس تک ہجرت کرنا پڑی۔(۲۲)اغصان اربعہ کے مصنف نے ملا عبدالعلی کے سوانح میں لکھا ہے: ''دراوائل حال صاحب ترجمہ علیہ الرحمۃ را سانحہ عظیم بوطنش لکھنؤ پیش آمدہ کہ بداں سبب روانہ شاہجہاں پور گشت''۔(۲۳) شاہجہاں پور کے علاوہ جس جگہ بھی تشریف لے گئے وہاں کے نواب یارئیس کی طلب پر ہی تشریف لے گئے اور ہر جگہ عزت واحترام زیادہ ہی ہوتا۔(۲۴)

اس سلسلے میں علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے حیات شبلی کے مقدمہ میں جو موتی بکھیرے ہیں وہ قابل دید اور قابل مطالعہ ہیں، لکھتے ہیں: ''ملا نظام الدین کے مشہور صاحبزادہ ملا عبدالعلی ہیں، جن کے دم سے یہ چشمۂ فیض بڑھ کر دریائے فیض بن گیا، اور دنیا نے ان کو بحر العلوم کہہ کر پکارا، یہ دریا لکھنؤ سے نکل کر بریلی اور رامپور سے ہوتا ہوا خلیج بنگال کے پاس بوہار پہنچا اور وہاں سے مدراس ہوکر بحر ہند کے کناروں سے مل گیا''۔(۲۵)

مولانا عبدالعلی لکھنؤ سے نکل کر جب شاہجہاں پور پہنچے ہیں اس وقت وہاں حافظ رحمت خان کی حکومت تھی، انھوں نے بڑی آؤ بھگت اور نہایت ہی تعظیم وتکریم کی۔ مولانا نے یہاں تقریباً بیس سال قیام کیا۔(۲۶) حافظ رحمت خاں نے مولانا کے مصارف کے لیے معقول رقم مقرر کردی اور ان کے طلبہ کے وظائف مقرر کردیے، نواب عبداللہ خاں رئیس شاہجہاں پور نے قلعہ میں لے جاکر اپنے مکان میں اتارا، دور دور سے طلبہ مولانا کا نام سن کر آنے لگے اور بہت بڑی درس گاہ قائم ہوگئی، بہت سے لوگ

فارغ التحصیل ہوکر نکلے، یہاں مولانا نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں، حافظ رحمت خاں نے جب شہادت پائی تو یہ اطراف نواب شجاع الدولہ کی حکومت میں آ گئے تو مولانا نے یہاں سے نکلنے کا ارادہ کیا، اس زمانہ میں رامپور کی ریاست پر نواب فیض اللہ خاں حکمراں تھے، وہ خود آ کر مولانا کو ساتھ لے گئے، چند روز تک مولانا نے یہاں قیام کیا، لیکن نواب صاحب مولانا کے گروہ طلبہ کی کفالت نہ کر سکے اور مولانا نے یہاں سے بھی نکلنے کا ارادہ کیا۔(۲۷)

رسالہ قطبیہ کے مطابق ان کو رامپور میں کوئی شکایت نہیں تھی، بلکہ منشی صدرالدین کے سخت اصرار کی وجہ سے مجبور ہوکر بوہار ضلع بردوان آ گئے تھے، منشی صدرالدین نے افسران انگریزی کی سفارشیں بھی نواب فیض اللہ خاں کے پاس بھجوائیں کہ وہ مولانا کو ادھر روانہ کر دیں۔(۲۸) منشی صدرالدین نے بوہار ضلع بردوان میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا، مولانا کے پاس زادراہ بھیج کر تشریف لانے کی درخواست کی، مولانا سوشاگردوں کے ساتھ بوہار کو روانہ ہوئے، قریب پہنچے تو منشی صدرالدین خاں خود استقبال کرنے آئے، چارسو تنخواہ مقرر کی اور مولانا کے تمام شاگردوں کے وظائف مقرر کیے۔(۲۹)

مولانا نے بوہار (مغربی بنگال) میں کچھ زیادہ زمانہ تک قیام کیا، یہ وہ زمانہ ہے کہ مدراس میں نواب والا جاہ محمد علی خاں والئی ارکاٹ کی حکومت تھی، وہ خاص قصبہ گوپامئو کے رہنے والے تھے، اس تعلق سے مولانا کے ہم وطن تھے، مولانا بعض اسباب کی وجہ سے بوہار سے دل برداشتہ ہو گئے تھے، یہ خبر جب نواب صاحب کو پہنچی تو فوراً درخواست بھیجی، مولانا بوہار سے روانہ ہوئے، مدراس کے قریب پہنچے تو نواب صاحب نے اعزۂ خاندان اور امرائے دربار کو ایک منزل آگے استقبال کے لیے بھیجا(۳۰) اور بیرون شہر سے علما و اعیان دولت نے استقبال کیا، مولانا پالکی پر سوار اور تمام اعیانِ دولت پاپیادہ ہمراہ اس شان سے نواب کرناٹک کے دولت خانہ پر پہنچے، نواب صاحب دروازہ تک مع شاہزادوں کے استقبال کو آئے، انہوں نے پالکی سے اترنے کا ارادہ فرمایا لیکن نواب صاحب نے کسی طرح اترنے نہ دیا اور خود پالکی کو کاندھا دے کر صدر مقام تک لے گئے،(۳۱) دربار میں جہاں خود ان کی نشست تھی مولانا کو اس جگہ بٹھایا اور خود مؤدبانہ سامنے بیٹھ کر مولانا کے قدم چومے اور کہا: اللہ اکبر! یہ نصیب کہاں تھے کہ حضور کا قدم میرے گھر آتا۔(۳۲)

نواب محمد علی خاں نے مولانا کو ایک نہایت عمدہ محل رہنے کو دیا، وہ روزانہ اپنے باورچی خانہ سے

کھانا بھجواتے اور ہمیشہ تعظیم وتکریم کرتے تھے،ایک بڑا مدرسہ تعمیر کروادیا جہاں مولانا درس دیتے تھے، ایک ہزار(۳۳) روپئے کا گرانقدر مشاہرہ مقرر کیا،مولانا کے ساتھ ہی ان کے داماد ملا ازہارالحق صاحب بھی تھے ان کی بھی سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی، مقیم طلبہ جن کی تعداد سو کے قریب تھی کے وظائف مقرر کیے،(۳۴) اطراف واکناف سے لوگ سفر کر کے مدراس تحصیل علم کے لیے آتے،ان لوگوں کو پڑھاتے بھی ،ساتھ ہی تالیف وتصنیف میں بھی برابر مشغول رہتے،ان کی تصانیف ہندوستان میں مشہور ہوگئی تھیں۔(۳۵)

نواب محمد علی خاں رئیس کرناٹک (مدراس) صاحب نے ان کے علم وفضل کا اعتراف کرتے ہوئے ''ملک العلماء'' کے خطاب سے سرفراز فرمایا(۳۶) اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے آپ کو ''بحرالعلوم'' کے لقب سے ملقب فرمایا جس کا ایک شاندار اور دلچسپ پس منظر ہے۔(۳۷)

اخلاق وعادات: مولانا کے اخلاق وعادات کی سب سے نمایاں صفت فیاضی اور دریادلی تھی، جو کچھ آتا تھا احباب اور فقرا میں تقسیم کردیتے تھے اس وجہ سے اہل وعیال نہایت تنگی سے بسر کرتے تھے اور عسرت وتنگ حالی کا شکوہ کرتے رہتے تھے لیکن وہ کچھ خیال ہی نہیں کرتے تھے،مزاج میں ادعاء و تمکنت تھی، کسی سے دبتے نہ تھے،مناظرہ کے بہت شائق تھے،ان کی تصنیفات میں بھی انداز طبیعت کی جھلک نظر آتی ہے۔(۳۸)

تصنیفات وتالیفات: ملا بحرالعلوم کو عربی وفارسی دونوں زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا اور ان دونوں ہی زبانوں میں ان کی تالیفات موجود ہیں جن کی تعداد سو سے زائد ہے اور یہ تالیفات معقولات و منقولات وتصوف میں ہیں،(۳۹) تالیفات میں وہ حقائق ودقائق ملتے ہیں اور شروح وحواشی میں اصل کتاب کا اس طرح حل اختصار کے ساتھ ہوتا ہے کہ اس کی نظیر ملنا دشوار ہے،تصانیف میں سے بعض کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔الارکان الاربعہ (فقہ میں) ۲۔تکملہ شرح تحریرالاصول (ابن ہمام) لوالدہ ۳۔تنویرالمنار شرح منارالاصول (فارسی) ۴۔میر زاہد شرح المواقف پر تین حواشی ۵۔تین رسالہ وحدۃ الوجود کے بارے میں ۶۔شرح تہذیب جلالیہ کے حاشیہ زاہدیہ پر حاشیہ ۷۔شرح صدرا پر حاشیہ ۸۔حاشیہ میر زاہد (رسالہ) ۹۔حاشیہ شرح ہدایۃ الحکمۃ ۱۰۔حاشیہ الشمس البازغۃ ۱۱۔حاشیہ شرح المواقف ۱۲۔حواشی

کتب درسی ۱۳۔حاشیہ زوائد ثلاثہ ۱۴۔احوال قیامت ۱۵۔رسالہ توحید ۱۶۔شرح سلم العلوم ۱۷۔شرح فقہ اکبر ۱۸۔شرح مثنوی مولانا روم ۱۹۔فوائد الرحموت شرح مسلم الثبوت ۲۰۔شرح مواقف قدیمہ و جدیدہ ۲۱۔العجالۃ النافعۃ (فی الالٰہیات) ۲۲۔المنہیات ۲۳۔ہدایۃ الصرف وغیرہ۔(۴۰)

مذکورہ بالا کتابیں اوران کے علاوہ دیگر تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یقیناً ''بحر العلوم'' تھے، درجۂ اجتہاد کو پہنچے ہوئے تھے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ابن الہمام، جلال دوانی اور صدرا شیرازی سے کسی طرح کم نہ تھے تو مبالغہ نہ ہوگا، جیسا کہ تذکرہ علمائے فرنگی محل کے مصنف مفتی محمد عنایت اللہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔(۴۱)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہندوستان میں جس قدر اور جہاں جہاں بڑے بڑے سلسلۂ درس قائم ہوئے اکثر اسی خاندان کا فیض ہے، مثلاً پورب میں محب اللہ بہاری اور غلام یحییٰ بہاری سے علم پھیلا، دونوں اسی خاندان کے شاگرد ہیں، رام پور ایک زمانہ تک درس گاہ عام تھا، یہ مولانا بحر العلوم اور ملا حسن کا فیض تھا، نجیب الدولہ نے دارانگر میں جوامروہہ کے قریب ہے ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس میں نہایت کثرت سے طلبہ نے تعلیم پائی، اس مدرسہ کے اکثر مدرسین اسی خاندان کے شاگرد تھے، بنگال اور مدراس میں جو کچھ علم پھیلا وہ مولانا بحر العلوم کا فیض ہے، غرضیکہ اس خاندان نے علم وفن کو اپنا مقصد زندگی قرار دیا اور اسی میں عمریں گذار دیں۔(۴۲)

وفات: اس حقیقی ''بحر العلوم''، ''ملک العلماء'' اور آسمان فضل وکمال کے نیر تاباں نے ۱۲ رجب سنہ ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۳/اگست سنہ ۱۸۱۰ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اپنے حقیقی مالک سے جاملے اور مدراس جو ان کی جائے وفات ہے وہیں سپرد خاک کیے گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اور ہم سب کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے، آمین۔

تاریخ وفات بلکہ سال وفات کے بارے میں کسی شاعر نے قطعہ کہا جس کے آخری مصرعہ سے ہجری تقویم کے مطابق سن وفات معلوم ہوتی ہے، قطعہ درج ذیل ہے:

کوس رحلت زد چو مولانا سوئے دار البقا داخل جنت شد آں مقبول درگاہ صمد

گفت ہاتف سال تاریخ وفاتش ایں چنیں شد نصیب مولوی عبد العلی جنت ابد(۴۳)

ہذا، وصلی اللہ علیہ وسلم

حواشی

(۱) اغصان اربعہ، ص ۱۲۱، حدائق الحنفیہ، ص ۴۶۷۔ (۲) حدائق الحنفیہ، ص ۴۶۷، لیکن تذکرہ علمائے فرنگی محل میں ابوالعیاش لکھا ہوا ہے جو یقیناً غلط ہے، دیکھیے تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۳۷۔ (۳) تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۳۷۔ (۴) تذکرہ علمائے ہند (فارسی)، ص ۱۲۲، نیز اس کا اردو ترجمہ، ص ۳۰۴۔ (۵) دیکھیے: اودھ آئینۂ ایام میں، ص ۱۱۷۔ (۶) دیکھیے: اودھ آئینۂ ایام میں، ص ۱۱۷۔ (۷) دیکھیے: اودھ آئینۂ ایام میں، ص ۱۱۷۔ (۸) مآثر الکرام، ص ۲۰۹، و اودھ آئینۂ ایام میں، ص ۱۱۸۔ (۹) دیکھیے: مآثر الکرام، ص ۲۲۰-۲۲۴، و اودھ آئینۂ ایام میں، ص ۱۱۸۔ (۱۰) دیکھیے: اغصان اربعہ، ص ۱۲۰-۱۲۱، و مقالات شبلی، ۳/۱۱۶۔ (۱۱) تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۳۷۔ (۱۲) اودھ آئینۂ ایام میں، ص ۱۹۹۔ (۱۳) تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲۲، و مقالات شبلی، ۳/۱۱۶۔ (۱۴) تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۳۷۔ (۱۵) اودھ آئینۂ ایام میں، ص ۱۱۸۔ (۱۶) تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲۲۔ (۱۷) اودھ آئینۂ ایام میں، ص ۱۹۹۔ (۱۸) تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲۲۔ (۱۹) تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۳۷-۱۳۸۔ (۲۰) اغصان اربعہ، ص ۱۲۱-۱۲۲۔ (۲۱) تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۳۸۔ (۲۲) تفصیل کے لیے دیکھیے: رسالہ قطبیہ بحوالہ مقالات شبلی، ۳/۱۶۶ و مابعدھا، و اغصان اربعہ، ص ۱۳۲-۱۳۳، و تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۳۸-۱۳۹، و ابجد العلوم، ص ۱۷۷، و دیار پورب میں علم اور علماء، ص ۱۴۰، و مقالات شبلی، ۳/۱۱۷-۱۱۸۔ (۲۳) اغصان اربعہ، ص ۱۲۲۔ (۲۴) تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۳۹۔ (۲۵) حیات شبلی، ص ۲۱۔ (۲۶) مقالات شبلی، ۳/۱۱۸۔ (۲۷) دیکھیے: اغصان اربعہ، ص ۱۲۲-۱۲۳ و تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲۲-۱۲۳، و نزہۃ الخواطر، ۷/۲۸۴، و مقالات شبلی، ۳/۱۱۸۔ (۲۸) دیکھیے: نزہۃ الخواطر ۷/ ۲۸۴، و مقالات شبلی، ۳/۱۱۸-۱۱۹۔ (۲۹) دیکھیے: اغصان اربعہ، ص ۱۲۳، و تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲۳، و نزہۃ الخواطر ۷/۲۸۴، و مقالات شبلی، ۳/۱۱۸۔ (۳۰) اغصان اربعہ، ص ۱۲۳-۱۲۴، و مقالات شبلی، ۳/۱۱۹۔ (۳۱) تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۳۹۔ (۳۲) دیکھیے: اغصان اربعہ، ص ۱۲۳-۱۲۴، و تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۳۹، و نزہۃ الخواطر، ۷/۲۸۵، و مقالات شبلی، ۳/۱۱۹۔ (۳۳) تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۳۹، لیکن اغصان اربعہ میں صفحہ ۱۲۳ پر چار سو روپئے کا ذکر ہے۔ (۳۴) اغصان اربعہ، ص ۱۲۳، و نزہۃ الخواطر، ۷/ ۲۸۵۔ (۳۵) دیکھیے: اغصان اربعہ، ص ۱۲۴-۱۲۶، و اغصان الانساب بحوالہ مقالات شبلی، ۳/۱۱۹، و تذکرہ علمائے فرنگی محل، ص ۱۳۹۔ (۳۶) دیکھیے: تذکرہ علمائے ہند، ص

۱۲۳، وتذکرہ علمائے فرنگی محل،ص ۱۳۹، واحوال علمائے فرنگی محل،ص ۶۵۔(۳۷)تفصیل کے لیے دیکھیے: تذکرہ علمائے فرنگی محل،ص ۱۴۰ - ۱۴۱، واحوال علمائے فرنگی محل، ص ۶۵۔(۳۸) دیکھیے: مقالات شبلی، ۳/۱۲۰ - ۱۲۱۔ (۳۹)دیکھیے: اودھ آئینۂ ایام میں،ص ۱۲۰۔(۴۰) دیکھیے: اغصان اربعہ،ص ۱۲۷، حدائق الحنفیۃ،ص ۴۶۷، و تذکرہ علمائے ہند،ص ۱۲۳، وتذکرہ علمائے فرنگی محل،ص ۱۴۰، ونزہۃ الخواطر، ۷/۲۸۶، واحوال علمائے فرنگی محل،ص ۶۵، واودھ آئینۂ ایام میں،ص ۱۲۰۔(۴۱) دیکھیے: تذکرہ علمائے فرنگی محل،ص ۱۴۰۔(۴۲) دیکھیے: مقالات شبلی، ۳/۱۲۲۔(۴۳)دیکھیے: ارکان اربعہ،ص ۱۲۷۔

مصادر ومراجع

(۱) ابجد العلوم، صدیق حسن القنوجی، دار ابن حزم، بیروت، ط: اُ، ۱۴۲۳ھ/ ۲۰۰۲ء(۲) اغصان اربعہ، ولی اللہ، مطبع کارنامہ، دار العلم والعمل فرنگی محل، لکھنؤ، سن طباعت: ۱۸۸۱ء۔(۳) اغصان الانساب، علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے اس کتاب کا ذکر ہے، تلاش بسیار کے باوجود یہ کتاب مجھے نہیں مل پائی۔(۴) اودھ آئینۂ ایام میں، مرتب: سید امجد حسین، شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطہ عامہ، لکھنؤ، اتر پردیش، مارچ ۱۹۹۶ء۔(۵) تذکرہ علمائے فرنگی محل، محمد عنایت اللہ، اشاعت العلوم، برقی پریس، فرنگی محل لکھنؤ۔(۶) تذکرہ علمائے ہند (فارسی)، رحمان علی صاحب، مطبع منشی نولکشور، لکھنؤ، ۱۹۱۴ء۔(۷) تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ)، محمد ایوب قادری، مع مقدمہ ڈاکٹر سید معین الحق، ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، پاکستان۔(۸) حدائق الحنفیۃ، فقیر محمد، مطبع منشی نولکشور لکھنؤ۔(۹) حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، سلسلۂ مطبوعات ۶۶، دار المصنّفین، اعظم گڑھ۔(۱۰) دیار پورب میں علم اور علماء، قاضی اطہر مبارکپوری، البلاغ پبلی کیشنز، نئی دہلی، ط: ۲، ۱۴۳۰ھ/ ۲۰۰۹ء۔(۱۱) رسالہ قطبیہ، عبد اللہ بن عبد العلی بحر العلوم۔ (۱۲) مآثر الکرام، میر غلام علی آزاد بلگرامی، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء۔(۱۳) مقالات شبلی، علامہ شبلی نعمانی، مرتبہ: سید سلیمان ندوی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ط: ۲، ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۵ء۔(۱۴) نزھۃ الخواطر وبھجۃ المسامع والنواظر، عبد الحیٔ الحسنی، دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدرآباد، ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۹ء۔(۱۵) احوال علمائے فرنگی محل، الطاف الرحمٰن، مطبع مجتبائی، لکھنؤ۔

دوقومی نظریہ اور مسلمان
(بہار کے حوالے سے)

☆ پروفیسر محمد سجاد

ترجمہ: جناب نورالزماں ارشد

عام لوگوں کے علاوہ تاریخ دانوں کے مابین بھی یہ تصور عام ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت ''دوقومی نظریہ'' (Two Nation Theory) کے حق میں تھی، یہ تصور مسلمانوں سے نفرت کرنے کی ایک بڑی وجہ ہے، حالانکہ بہار میں لیگ کے علاحدگی پسندی پر مبنی رجحانات وفرقہ پرستانہ سیاست کی مخالفت ومزاحمت میں امارت شرعیہ، جمعیۃ العلماء، شیعہ، مومن وراعین اوران کی جماعتوں کے علاوہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کمربستہ تھی، اس تناظر میں یہاں بہار کے حوالے سے تاریخی تفصیلات دی جارہی ہیں۔

صرف مسلمانوں پر تقسیم ہند کا الزام عاید کرنے کی سیاست کی تردید کے لیے بہار کی مثال ضروری ہے، مسلمانوں کی جانب سے علاحدگی پسندی کی مخالفت اور مزاحمت پنجاب، بنگال اور اترپردیش میں بھی تھی لیکن مسلم لیگ کی فرقہ پرستانہ سیاست کے خلاف سب سے زیادہ سخت آواز بہار کی مسلم قیادت نے اٹھائی تھی، مشترکہ اور متحدہ وطنیت کے لیے بہار کے مسلمانوں نے کہیں زیادہ وابستگی ظاہر کی، شاہ محمد (۱۸۹۴-۱۹۷۸ء) نے اپنی سوانح حیات ''تلاش منزل'' میں پہلی باراس پر اپنا خیال پیش کیا۔اس کتاب کو ۱۹۴۲-۴۴ء میں تب لکھا گیا جب وہ ۱۹۴۲ء کے بھارت چھوڑو آندولن میں حصہ لینے پر ہزاری باغ جیل میں قید تھے، یہ کتاب ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔

جہاں تک مسلم لیگ کے لاہور اجلاس اور پاکستان کی تجویز کی قبولیت کا تعلق ہے تو اجلاس

☆ شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

میں شرکت بڑھانے کے لیے بڑی تعداد میں یہاں اشتعال انگیز پروپیگنڈا اور سرگرم مہم چل رہی تھی، یہ بات قابل غور ہے کہ تیزی سے بدلتے مناظر میں سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے مذہب اور مذہبی مقامات کا استعمال کھل کر کیا گیا، مسلمانوں اور متعلقہ قوم پرست گروہوں نے ۲۷-۲۹ اپریل ۱۹۴۰ء کو دہلی میں ایک کانفرنس منعقد کی تاکہ مسلم فرقہ پرستوں کی رجعت پسند اور تخریبی طاقتوں کو شکست دی جاسکے، اس اجلاس میں ہندو مسلم اتحاد اور مذہبی رواداری پر زور دیا گیا۔

''نقیب'' نے دوقومی نظریہ کو مسترد کر دیا: مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد (۱۸۸۰-۱۹۴۰ء) نے لیگ کی علاحدگی پسندی کے خلاف انتہائی بہترین اور تیز ردعمل کا اظہار امارت شرعیہ کے اردو ہفتہ وار اخبار نقیب کے ۱۴/ اپریل ۱۹۴۰ء کے شمارے میں کیا، اس طویل مضمون کا عنوان ''مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا کی اسکیم پر ایک اہم تبصرہ'' تھا، یہ عنوان نہ صرف امارت شرعیہ (۱۹۲۱ء) کے سیاسی نظریے کی عکاسی کرتا ہے بلکہ استعمار کے خلاف اسلامی وسائل کے استعمال کا تحریری ثبوت بھی پیش کرتا ہے، مولانا سجاد نے جناح اور ان کے ساتھیوں کے سامنے کچھ بے حد مشکل سوال رکھ دیے، ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں پر ہو رہے ظلم وستم پر جناح و لیگ کے رہنما ہائے توبہ مچا رہے تھے، جب کہ وہ مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کے لیے علاحدہ ملک بنانا چاہتے تھے، مولانا سجاد نے لوگوں سے اپیل کی کہ ہندو و مسلمان مل کر مکمل آزادی کے لیے جدوجہد کریں اور ایک ایسا جمہوری ہندوستان قائم کرنا چاہیے جہاں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ماتحت نہیں ہوں۔

اس سے قبل نقیب (۲۰ فروری ۱۹۴۰ء) میں مولانا سجاد نے فرقہ وارانہ تنازعہ کے حل کے لیے کچھ حد تک جارحانہ تجاویز پیش کی تھیں، اپنے مضمون ''فرقہ وارانہ معاملات کا فیصلہ کن اصولوں پر ہونا چاہیے؟'' میں لکھتے ہیں کہ کسی کو بھی اپنے مذہبی عقیدے کو عوامی شعبے میں اس طرح ظاہر نہیں کرنا چاہیے کہ یہ دوسروں کے عقیدے کے لیے بھی بحران پیدا کر دے، اسے ذاتی حد تک ہی محدود ہونا چاہیے، جناح سے ہوئی خط و کتابت میں انہوں نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ لیگ جاگیرداروں اور سرمایہ دارانہ مسلمانوں کے برعکس عام مسلمانوں کے لیے کسی بھی طرح کا کوئی تعمیری، اقتصادی پروگرام پیش کرنے میں ناکام رہی ہے، علاحدہ قومی ریاست کو عمل میں لانے والی لیگ کی حکمتوں کے خلاف مولانا سجاد کی دانشورانہ تنقید ان کے فکر کی عکاسی کرتی ہے کہ آنے والے وقت میں مذہب کے نام پر

جذباتی استحصال کا ہتھیار نہیں بننا چاہیے۔

امارت شرعیہ کے مولانا سجاد ہی کی طرح دیوبند کی قیادت بھی ہندوستان کے اتحاد کے لیے کھڑی تھی، جمعیۃ علمائے ہند نے بہت سارے دوسرے مسلم اداروں کے ساتھ مل کر ۲۷-۳۰/اپریل ۱۹۴۰ء کو دہلی میں ''آزاد مسلم کانفرنس'' کا انعقاد کیا، سید طفیل احمد منگلوری (۱۸۶۸-۱۹۴۶ء) نے اپنی کتاب ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' میں لکھا ہے کہ الگ الگ علاقوں اور ریاستوں کے تقریباً ۷۵ ہزار افراد نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی، اس کانفرنس نے اقلیت کی آواز ہونے کا دعویٰ کیا، اس نے واضح طور پر اعلان کیا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا مقصد مکمل آزادی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے مذہبی اور فرقہ پرست حقوق کا تحفظ بھی ہے۔

بقول منگلوری ۶ تا ۸ مئی ۱۹۴۴ء کو کلکتہ میں شیخ محمد جان کے زیر انتظام ''آل انڈیا مسلم مجلس'' کے زیر اہتمام کچھ مسلم گروہ دہلی میں دوبارہ جمع ہوئے، آل انڈیا مسلم مجلس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان بدستور ایک متحدہ ملک رہنا چاہیے، منگلوری نے خود ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' ۱۹۳۷ء کے پانچویں ایڈیشن میں پاکستان کے تخیل پر تنقید کی تھی، جس کے ذیلی عنوان کچھ اس طرح تھے: ''تاریخی پس منظر''، ''پاکستان ایک بڑی رکاوٹ''، ''کیسے مسلم اکثریتی صوبہ کو مسلم اقلیتی صوبہ میں تبدیل کردیا گیا'' (جناح ۱۹۱۶ء، لکھنؤ معاہدہ) اسی طرح جمعیۃ العلماء ہند کے مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی (۱۹۰۱-۱۹۶۲ء) نے ۱۹۴۵-۴۶ء کے انتخابات سے قبل ہی اپنے کتابچہ ''تحریک پاکستان پر ایک نظر'' میں لیگ کے نظریہ پاکستان پر تنقید کی تھی، یہ بجنور کے نیم ہفتہ وار ''مدینہ'' میں شائع ہونے والے ان کے مضامین کا مجموعہ تھا۔

مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد آزاد مسلم کانفرنس کے ساتھ ہو، یہ لیگ اور برطانوی حکومت کے عین موافق نہ تھا، یہ بات حسین شہید سہروردی (۱۸۹۲-۱۹۶۰ء) اور لیوپولڈ امری (۱۸۳۷-۱۹۵۵ء) کے مابین ہوئے خط وکتابت سے ظاہر ہوتی ہے، اس مراسلے میں آزاد پارٹی کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کہا گیا کہ مسلم لیگ بلاشبہ ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات کی نمائندگی کرتی ہے۔

یہ مراسلت لیگ و برطانوی حکومت کی سازش کو بھی ظاہر کرتی ہے، جب ستمبر ۱۹۴۴ء میں گاندھی جناح میں بات چیت چل رہی تھی تو اس کو ناکام بنانے کے سرکاری منصوبے بھی چل رہے تھے، واویل نے کہا کہ ہم نے نچلے طبقوں کو کھینچ کر اس میں شامل کیا اور ساتھ ہی دیگر بولنے والی اقلیتوں کو بھی

واضح طور پر اکسایا کہ مسئلہ کے حل کی ہر کوشش کو ناکام کردیں۔

مومن کانفرنس کا لیگ کے خلاف احتجاج: ایک اور تنظیم تھی مومن کانفرنس جو مستقل طور پر مسلم لیگ کے خلاف جدوجہد کررہی تھی، ۲۶-۱۹۲۵ء میں روہتاس میں قائم شدہ اس تنظیم کی شاخ بہار کے کئی اضلاع کے ساتھ ساتھ دوسری ریاستوں میں بھی تھی، اس سے پہلے ادارہ ''فلاح المومنین'' بھی تھا، اس کا ایک مقصد غیر اسلامی رذیل/شریف (کمتر و اشرافیہ) تقسیم بھی تھا، اسی دور میں مومن کانفرنس نے مسلم لیگ کے نعرے ''اسلام خطرے میں ہے'' کی پرزور مخالفت کی، ۲۱/اپریل ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کی لاہور قرارداد کی مخالفت میں بہار ریاست مومن کانفرنس منعقد کی گئی، اس میں عبدالقیوم انصاری (۱۹۰۵-۱۹۷۴ء) نے کہا ''اسلام خطرے میں ہے'' کہنا کفر ہے، انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ دونوں فرقوں کے مابین لیگ کے ثقافتی عدم مساوات کے دلائل قابل اعتبار نہیں ہیں، لیگ کے پاکستان منصوبہ پر تنقید کرتے ہوئے اپنا موقف ظاہر کیا اور کہا کہ پلان ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کے تحفظ میں ناکام ہوجائے گا، عبدالقیوم انصاری نے اس بات پر تشویش ظاہر کی کہ اگر منصوبۂ پاکستان عمل میں آجاتا ہے تو ہندو اکثریتی علاقوں میں مسلمانوں کی زبان و ثقافت خطرے میں پڑ جائے گی، جس کے تحفظ پر مسلم لیگ ہنگامہ آرا ہے، اس کانفرنس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ مسلم اکثریتی علاقوں میں مومن اور دیگر مزدور طبقوں کو رذیل سمجھا جاتا ہے اور ویسا ہی عمل کیا جاتا ہے، لہٰذا پاکستان کے مطالبہ کی تائید کے لیے کانفرنس میں انصاری نے بھی حوصلہ افزائی کی کہ غیر اسلامی مسلم لیگ کے وجود کو ختم کرنے کے لیے ہر سچا مومن کوشش کرے۔

مومن کانفرنس کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے قیوم انصاری نے راجندر پرساد کے ساتھ ہوئی اپنی خط و کتابت (۳۰/اکتوبر ۱۹۳۹ء) میں بیان کیا کہ لیگ کو اشراف یعنی اعلیٰ طبقے کے افراد چلارہے ہیں، وہ بظاہر غریب مسلم اور نچلے طبقوں کے خلاف ہیں، زیادہ تر مومن غریب اور پس ماندہ ہیں، لہٰذا لیگ جیسی اشرافیہ تنظیم سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔

دسمبر ۱۹۳۹ء میں انصاری نے جواہر لال نہرو کو ایک خط لکھا جس میں انہوں نے کہا کہ تاریخ اور تجربہ نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ اعلیٰ طبقوں کے مسلمانوں کے زیر انتظام کسی بھی ادارے پر اعتبار نہ کریں، مسلم لیگ ایسا ہی ایک ادارہ ہے، گاندھی جی اور راجندر پرساد سے ۱۹۳۹ء میں ہوئی اپنی ایک

مراسلت میں انصاری نے یہاں تک مطالبہ کیا کہ مرکزی اور ریاستی قانون ساز اسمبلیوں اور دستور ساز اسمبلی میں مسلم نشستوں کا ۵۰ فیصد مومنوں یعنی ارذال کے لیے مخصوص کیا جائے۔

لیگ اور مومن کانفرنس کے درمیان اختلافات اتنے گہرے تھے کہ ووٹ شماری کے معاملے پر بھی ابھر کر سامنے آگئے، بہار صوبائی مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یہ ہدایت دی کہ خود کو بطور مسلمان رجسٹریشن کروائیں، لیکن مومن کانفرنس نے اس بنیاد پر اس کی مخالفت کی کہ یہ نوآبادیاتی ریکارڈ میں مومنوں کی تعداد کو کم کرنے کی سازش ہے، مومن کانفرنس نے اپنے ممبروں سے کہا کہ وہ خود کو مومن کے طور پر رجسٹریشن کروائیں۔

یہ ایک معمہ ہی ہے اور تحقیق کا موضوع ہے کہ عبدالقیوم انصاری بی آر امبیڈکر (۱۸۹۱۔۱۹۵۶ء) کے ساتھ کسی بھی گفتگو اور افہام وتفہیم کے لیے آگے کیوں نہیں آئے؟ امبیڈکر کی کتاب پاکستان یا تقسیم ہند سے پہلے ہی شائع ہو چکی تھی، اس میں امبیڈکر نے مسلمانوں میں ذات پات کے نظام کے وجود کی تردید کی تھی، انصاری نے رام منوہر لوہیا (۱۹۱۰۔۶۷ء) کے ساتھ بھی اس معاملے میں کوئی بات چیت نہیں کی، ہماری معلومات کے مطابق انہوں نے دستور ساز اسمبلی کے کسی بھی رکن کو متاثر کرنے کی کوشش نہیں کی کہ ارذال مسلمانوں کو درج فہرست ذات/ نچلے طبقے (SC) کے زمرے میں شامل کیا جائے۔

راعین اور منصوریوں کا مسلم لیگ پر اعتراض: مومنوں کے علاوہ مسلمانوں کی کچھ دوسری پس ماندہ جماعتیں بھی ۱۹۴۰ء تک کافی منظم ہوگئی تھیں، بہار میں راعین کانفرنس (قائم شدہ ۲۰/ اکتوبر ۱۹۳۲ء) نے زین الدین کی صدارت میں آرہ میں ایک کانفرنس کا انعقاد کیا، جس میں انہوں نے مومن کی طرح مسلم لیگ کی اشرافیہ سیاست پر تنقید کی، امتیازی سلوک کے لیے لیگ کو تنبیہ کرتے ہوئے انہوں نے یہ کہا کہ وہ لیگ اور اعلیٰ ذات کے مسلمانوں کے خلاف لڑائی جاری رکھیں گے، مومنوں کی طرح نچلی ذاتوں کی مشترکہ طاقتوں کے ساتھ وہ بھی کانگریس میں پناہ لیں گے، اس راہ پر چلتے ہوئے مسلمانوں کی منصوری (دھنیا) برادری نے ایک ادارہ بہار جمعیت المنصور قائم کیا جو ۱۹۲۰ء سے ہی کام کررہا تھا، جمعیت المنصور کے علاوہ جمعیت القریش (۱۹۳۰ء میں قائم شدہ قصائیوں کی تنظیم) بہار میں مومن کانفرنس کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چل رہی تھی۔

شیعوں نے جناح کو درکنار کیا: پس ماندہ ذاتوں کی طرح مسلمانوں کے اہل تشیع نے بھی خود کو آل انڈیا شیعہ سیاسی کانفرنس کے طور پر منظم کیا، زیادہ تر شیعہ اشرافیہ ہی ہیں، بہار یونٹ کی شیعہ سیاسی کانفرنس نے ۱۸؍اپریل ۱۹۴۰ء کو چھپرا میں ایک سیاسی کانفرنس کا اہتمام کیا، کانفرنس میں شامل تمام ممبران نے لیگ کی لاہور تجویز کی مذمت کی۔

۲۲؍اکتوبر ۱۹۴۴ء کو شیعہ سیاسی کانفرنس کے صدر سید علی ظہیر نے جناح کو ایک خط لکھا جس میں انہوں نے درخواست کی کہ مسلم لیگ مجوزہ پاکستان کے منصوبے میں شیعوں کی حیثیت کو واضح کرے، انہوں نے مجوزہ پاکستان میں شیعوں کے لیے کچھ یقین دہانیوں کا مطالبہ کیا، ظہیر کے خط کے جواب میں جناح نے بظاہر کچھ نہیں کہا، یہ ابہام شیعہ سیاسی کانفرنس کو قبول نہ تھا۔

۲۹-۳۱ دسمبر ۱۹۳۹ء کو چھپرا میں ہونے والی کانفرنس میں شیعہ سیاسی کانفرنس نے مخلوط طریقۂ انتخاب کا مطالبہ کیا، یہ جداگانہ طریقۂ انتخاب کے خاتمے کا مطالبہ تھا، جلسہ میں کانفرنس کے جنرل سکریٹری جعفر حسین نے کہا کہ شیعوں کے لیے یہ خطرناک ہوگا کہ وہ خود کو کانگریس سے دور رکھیں، شیعہ سیاسی کانفرنس کے مقاصد کو پیش کرتے ہوئے مولوی سجاد نے کہا کہ شیعہ سیاسی کانفرنس کا مقصد ملک وقوم کے لیے زندہ رہنا اور مرنا ہے، انہوں نے مادر وطن کی آزادی کے لیے سب کچھ قربان کرنے پر بھی زور دیا، ''سرچ لائٹ'' نے اپنے اداریہ میں لیگ کے ساتھ شیعہ رشتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ شیعہ منظم طور پر لیگ کے ساتھ نہیں ہیں اور اس کے ساتھ جانا بھی نہیں چاہتے ہیں۔

لیگ کے جداگانہ طریقۂ انتخاب کی منطق اور جھگڑے کی مخالفت کی بنیاد پر مومن، منصوری، راعین، شیعہ وغیرہ کے نظریات اور رجحانات کی جانچ پڑتال کے بعد انڈین نیشنل کانگریس کے مسلم سیاست دانوں کے خیالات ورجحانات کی جانچ کی جاسکتی ہے، لیگ کی لاہور تجویز پر انہوں نے کیا ردعمل ظاہر کیا؟ کیا وہ اپنے ردعمل کے ساتھ عوامی سطح پر گئے؟

سید محمود (۱۸۸۹-۱۹۷۱ء، کانگریس) نے لیگ کی لاہور تجویز پر سختی سے تنقید کرتے ہوئے کہا کہ دوقوموں کی تقسیم کے نظریہ اور منصوبے کی کوئی تاریخی اساس نہیں ہے، اس سے ہندوؤں یا مسلمانوں کو نہیں صرف انگریزوں کو فائدہ ہوگا۔

۲۷-۲۹؍اپریل ۱۹۴۰ء کو دہلی میں ہونے والی قوم پرست مسلمانوں کی کانفرنس میں شامل

ہونے کا مطالبہ کرتے ہوئے عبدالباری، انیس الرحمٰن، ایس ایچ رضوی جیسے لوگوں نے کہا کہ تمام آزادی پسند، محب وطن مسلمانوں کو مسلم رجعت پسند تخریبی طاقتوں کو شکست دینے کے لیے متحد ہونا چاہیے، اپریل ۱۹۴۰ء میں دربھنگہ میں بہار ریاستی طلبہ کانفرنس کے جلسہ میں مسلم لیگ کی لاہور قرارداد کی کھلے طور پر مذمت کی گئی اور غم وغصہ کا اظہار کیا، ۲۰/اپریل ۱۹۴۰ء کو پٹنہ میں "یوم ہندوستان" کو جشن کی طرح منایا گیا، جس میں پاکستان کے منصوبے کی پرزور مذمت کی گئی، جلسے کو خطاب کرتے ہوئے عبدالباری نے اس معاملے کو اٹھانے کے لیے مسلم لیگ کی تنقید کی، لیگ کے پاس مسلمانوں کے لیے تخلیقی منصوبہ بندی نہیں تھی، صرف وہی تحریک چل سکتی ہے جو لوگوں کی غربت، ناخواندگی، صحت اور معاشی پس ماندگی جیسے مسائل کو حل کرنے کے لیے کام کرتی ہو۔

سونپور میں ستیہ گرہ ٹریننگ کیمپ کے زیر اہتمام اپنے خطبات میں انہوں نے مسلم لیگ کے ارادوں کو شکست دینے کے لیے مسلمانوں سے براہ راست بات چیت کرنے کی اہمیت پر زور دیا، باری نے مولانا حسین احمد مدنی (۱۸۷۹-۱۹۵۷ء)، رفیع احمد قدوائی (۱۸۹۴-۱۹۵۴ء) اور حافظ محمد ابراہیم (۱۸۸۸-۱۹۶۸ء) کے ساتھ مل کر تجویز پیش کی کہ کاشتکاروں کی فلاح وبہبود، اجرت میں کمی، مزدوری میں اضافہ، روزگار کی اسکیمیں نوآبادیاتی حکومت سے آزادی کے لیے ضروری شرائط ہیں۔

لیگ کے ارادوں کو مسمار کرنے کے لیے لیگ کے لاہور منصوبے سے کئی مہینے قبل ہی کوشش کی جارہی تھی، مسلم قیادت نے مسلمانوں کو لیگ سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی، جنوری ۱۹۴۰ء انگریزی روزنامہ سرچ لائٹ میں عرب مسلمانوں کے ذریعہ جناح کی پرزور مذمت کی خبر موصول ہوئی، اس میں کہا گیا کہ جناح کے کارنامے غیر وقتی، غیر معقول اور غیر مفید ہیں۔

جمہور مسلم لیگ کی علاحدگی پسندی کے خلاف جدوجہد: مظفرپور کے مغفور احمد اعجازی (۱۹۰۰-۱۹۶۶ء) نے آل انڈیا جمہور مسلم لیگ (اپریل ۱۹۴۰ء) صرف لیگ کی علاحدگی پسندی کی مخالفت کرنے کے لیے مظفرپور میں قائم کی تھی، لیگ کی لاہور تجویز کے خلاف انہوں نے گھر گھر جاکر (۱۹۴۶-۴۷ء) لوگوں سے ملاقات کرنے کی مہم چلائی، ۱۹۴۲ء میں انہوں نے اپنی لیگ کو کانگریس میں ضم کردیا، انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اکثر فرقہ وارانہ فسادات کے درمیان سائیکل پر گاؤں گاؤں کا دورہ کیا اور لیگ کی جداگانہ قومیت کے خلاف مسلمانوں کو مذہبی انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔

متعدد مسلم پارٹیوں کی مسلم لیگ کی تجویز کی مخالفت کے باوجود گاندھی کا خیال تھا کہ لیگ مسلمانوں کی سب سے طاقتور تنظیم ہے اور جناح ہندوستانی مسلمانوں کے نمائندے ہیں، گاندھی جیسی شخصیت کا جناح سے متعلق یہ خیال مومن کانفرنس کے لیے الجھن کی بات تھی، مومن کانفرنس کا خیال تھا کہ ۱۹۳۹ء میں اگر کانگریس نے مسلمانوں کے چھ مطالبات کو تسلیم کرلیا ہوتا تو لیگ کے زہریلے دانت خود ہی ٹوٹ جاتے، ۱۹۴۰ء میں نہرو نے ان مطالبات کا جواب اس دلیل کے ساتھ دیا کہ نشستوں کے ریزرویشن سے کمیونٹی کمزور ہی ہوگی، یہ نہ تو عملی ہے اور نہ ہی ضروری بلکہ اس کے برعکس یہ بہت خطرناک ہے۔

بہاری مسلمانوں کی علاحدگی پسندی اور نوآبادیاتی مخالف عزم کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ ۱۹۴۲ء کے بھارت چھوڑو آندولن میں بڑی تعداد میں شامل ہوئے، ۲۵ جولائی ۱۹۴۲ء کو اپنے بیٹے کی موت کے باوجود مغفور ہمت کے ساتھ کھڑے رہے اور مضبوطی کے ساتھ بھارت چھوڑو آندولن ۱۹۴۲ء میں مظفر پور کے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے رہے، ۳۰ ستمبر ۱۹۴۲ء کو سیتا مڑھی کے باجپٹی ریلوے اسٹیشن پر پولیس نے پانچ مسلمانوں کو شہید کردیا تھا، پٹنہ کے مشہور شاعر کلیم عاجز اپنی سوانح عمری میں یاد کرتے ہیں کہ پٹنہ میں بہار نیشنل کالج کے سامنے ایک نوجوان عبدالقدوس نے ایک ظالم پولیس انسپکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پورے جوش میں نعرے لگائے: بھارت چھوڑو، انقلاب زندہ باد! اس نے ایسا اثر ڈالا کہ بالآخر وہ پولیس انسپکٹر بھی اس قومی تحریک میں شامل ہوگیا۔

قوم پرست مسلم تنظیم اتنی مضبوط تھی کہ کانگریس کے بجائے امارت شرعیہ، جمعیت علما اور مومن کانفرنس کے رہنما ہی ۱۹۴۶ء کی انتخابی مہم کی نگرانی کررہے تھے، انتخاب سے عین پہلے جمعیت علما بھی لیگ کی مخالفت میں آ گئی، اس حقیقت کے باوجود کہ مولانا مودودی (۱۹۰۲-۷۹ء) جمعیت علما کے سابق رفیق اور ۱۹۲۵ء میں اس کے ترجمان ''الجمعیۃ'' کے مدیر تھے۔

ایسا اس لیے بھی ہوا کہ بعد میں الگ ہوکر انھوں نے ۱۱؍مارچ ۱۹۴۱ء کو پٹھان کوٹ (پنجاب) میں جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی، لیگ کی پرزور مذمت کے بعد مولانا مودودی اس حد تک چلے گئے کہ جناح کی ذاتی زندگی اور پاکستان کے نظریے کی شدید مذمت کی۔

۱؍مئی ۱۹۴۵ء کو لیگ کے اخبار ''نوائے وقت'' (لاہور) میں مودودی نے غیر منقسم ہندوستان

میں ہندو مسلم مسئلہ کے حل کے لیے وفاقی نظام کے تحت تجاویز بھی پیش کیں، خاص طور سے مسلم اقلیتی صوبوں کے لیے۔ لیگ کے خلاف بہار کی تقریباً تمام بڑی تنظیمیں پر امید تھیں کہ وہ وسیع پیمانے پر انتخابی مہم چلاتے ہوئے اچھی نشستیں حاصل کریں گی، یہاں تک کہ ۲ مارچ ۱۹۴۶ء کو راجندر پرساد کو بھی کانگریس سے منسلک تنظیموں کے بہار میں ۵۰ فیصد مسلم سیٹ حاصل کرنے کی توقع تھی لیکن نتیجہ برخلاف اور صدمے کی طرح سامنے آیا، لیگ ۴۰ میں سے ۳۴ سیٹیں اپنے قبضہ میں کرنے میں کامیاب رہی، حالانکہ لیگ کو بھی ایسے نتائج کی توقع نہیں تھی، کانگریس نے مسلم حلقوں میں ۹/امیدوار کھڑے کیے تھے لیکن کامیابی صرف ایک نے حاصل کی، کانگریس کے لیے سب سے بڑی پریشانی کا سبب پروفیسر عبدالباری کی شکست تھی جو تحریک خلافت کے دوران آزادی کی جدوجہد میں شامل تھے۔

۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کی انتخابی فتح: یہ سوال ہمارے ذہن میں شدت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے کہ ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کی فتح کی وجہ کیا تھی؟ مورخین کی ایک بڑی تعداد کا خیال ہے کہ نظریہ پاکستان کی جغرافیائی غیر یقینی صورت حال جناح کی سیاسی طاقت تھی جس سے پا بیا گھوش قطعی متفق نہیں ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کی لاہور قرارداد کے وقت یہ بات بالکل واضح ہوگئی تھی کہ مسلم اقلیتی صوبوں کو نئے پاکستان سے دور رکھا جائے گا، لیگ کے بیشتر رہنماؤں کو یہ واضح کرنا پڑا کہ اگر اقلیتی صوبوں میں ہندو مسلمانوں کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں تو ہم مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی ٹھیک ویسا ہی رویہ اختیار کریں گے۔

تاریخ دانوں کا خیال کچھ بھی ہو، عموماً لوگ منتقلی کے خوف سے لیگ کے پاکستان کی حمایت کرنے پر راضی نہیں تھے، لہٰذا لیگ کو ایک زبردست پروپیگنڈا مہم چلانی پڑی، لوگوں کو یقین دلانے کے لیے لاہور قرارداد میں منتقلی کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا، نظریہ ضمانت کو آگے بڑھانے کے پیچھے یہی مقصد تھا، لوگوں کو سمجھایا گیا کہ جو لوگ جہاں ہیں وہیں رہیں، ہندو ملک میں مسلمان اور مسلم ملک میں ہندو ضامن ہونے کے ناطے دونوں ممالک میں اقلیتوں کے تحفظ کی ضمانت بن جائے گی۔

"یادگار زندگی" (۱۹۷۲ء) کے اے حمید کی سوانح عمری ہے، اس میں درج ہے کہ انہوں نے سردار پٹیل کو تقسیم پر ایک خصوصی رائے عامہ کے لیے تیار کرنے کی بھرپور کوشش کی، سردار پٹیل خاموش رہے، بعد میں حمید کو یہ احساس ہوا کہ پٹیل نے من ہی من میں یہ قبول کرلیا ہے کہ اسے نظر انداز کرنا ان کی غلطی تھی۔

تاریخ دانوں کے مابین اس بات پر پرزور بحث ہوئی کہ اگر اس مسئلے پر عمومی طور پر بالغوں کی رائے دہی ہوئی ہوتی تو مسلم لیگ کے لیے ملک کو تقسیم کرپانا ناممکن ہوتا، تاہم ۱۹۴۶ء کے انتخابات ایک طرح سے پاکستان کے لیے رائے عامہ ہموار ہونے کے مترادف تھے۔

اپریل ۱۹۴۶ء میں بہار کے وزیر اعلیٰ سری کرشن سنہا (۱۸۸۷-۱۹۶۱ء) نے کہا تھا کہ اقلیتوں کا کانگریس پر پختہ یقین ہے، سنہا نے اعتراف کیا کہ لیگ کی انتخابی جیت کا تعلق پرتشدد انتخابی مہم سے ہے، اس نے کافی حد تک مسلمانوں کو خوف زدہ کیا۔

ایک بات یہ بھی تھی کہ پڑھے لکھے مسلمان بھی نہیں سمجھتے تھے کہ پاکستان کا کیا مطلب ہے، اگر پاکستان بنایا گیا تو کیا یہ صحیح ہوگا، یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۴۶ء کے انتخاب میں ہندوستان کی کل آبادی (جس میں ہندو مسلم بھی شامل ہیں) کے صرف ۱۳ فیصد کو ہی رائے دہی کا حق حاصل تھا نیز رائے دہی کا حق جائداد کی ملکیت کی شرائط سے وابستہ تھا، ۶۴ روپیہ سالانہ مال گزاری یا ۲۵ روپے چوکیداری ٹیکس دینے والا، ساتھ ہی ہائی اسکول پاس مرد اور پڑھی لکھی عورتوں کو ہی ووٹ ڈالنے کا حق حاصل تھا، نو آبادیاتی حکومت کو بخوبی اندازہ تھا کہ محدود رائے دہی کا حق جناح کی لیگ کے لیے مددگار ثابت ہوگا۔

ہندو فرقہ پرستی، مہا سبھا-کانگریس کا گٹھ جوڑ: کانگریس کے مشہور رہنماؤں کے جیل میں ہونے کی وجہ سے مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا کا تیزی کے ساتھ زور بندھا، بہت سے کانگریسی ہندو مہاسبھا سے وابستہ تھے، غرض یہ کہ اسی سے مسلمانوں میں کانگریس کے خلاف عدم اطمینان پیدا ہوا، بہار میں بڑھتی فرقہ وارانہ کشیدگی کو مسلم لیگ نے کچھ حد تک اطمینان سے دیکھا، کیونکہ اس نے انتخابات میں نمایاں کامیابی کے لیے مواقع فراہم کیے، ۱۹۴۵ء کے بعد کانگریسی قائدین نے ہندو مہاسبھا کے ساتھ انتخابی اتحاد کا اعلان کرنا شروع کردیا، یہاں تک کہ راجندر پرساد نے بھی اس سے اتفاق کیا، تاہم نہرو نے آگاہ کیا تھا کہ ایسا نظام لیگ کے پروپیگنڈا کو مزید ہوا دے گا کہ کانگریس ہی اصل میں ہندو مہاسبھا ہے۔

انتخابات میں قوم پرست مسلم تنظیموں کی شکست کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس انتخابات لڑنے کے لیے بہت کم وسائل تھے، اس کے برعکس مسلم لیگ نے انتخابی مہم میں بڑی رقم خرچ کی تھی، قائدین کو معلوم تھا کہ معاشی بے بسی انتخابات کے آخری نتائج میں بڑا کردار ادا کرے گی، چنانچہ مدد وتعاون کے لیے کانگریس سے خط و کتابت کرنی پڑی تھی، حالانکہ یہ درخواست نامنظور کردی گئی تھی،

انتخابی شکست کی ایک بڑی وجہ قوم پرست سیاست دانوں کی مالی پس ماندگی بھی تھی۔

دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ کانگریس اور قوم پرست مسلم تنظیمیں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے میں ناکام رہیں، انتخابات میں ایک مشترکہ منشور کے سامنے نہ آنے کی وجہ سے انتخابی مہم نہ تو واضح اور نہ ہی متفقہ رہی، مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا امتیازی سلوک لیگ کا اصل مسئلہ تھا، قوم پرست مسلمانوں نے کانگریس سے اس کو مسترد کرنے کے لیے کچھ مطالبات کیے جن کی تکمیل نہ ہو سکی۔

بہت پہلے ۱۹۳۹ء ہی سے بہار کی قوم پرست مسلم تنظیموں (امارت شرعیہ) نے کانگریس کے خلاف مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے فاصلے کے خلاف کانگریس کو آگاہ کرنا شروع کر دیا تھا لیکن معاملے کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا، اسی وجہ سے پٹنہ سے تعلق رکھنے والے قوم پرست مسلمان محمد یونس کو یہ کہنا پڑا کہ کانگریس مسلمانوں سے عوامی تعلقات کے بارے میں بات کرتی اور لکھتی تو ہے لیکن کرتی کچھ بھی نہیں، اس کے لیے کانگریس کے علاوہ کوئی اور ذمہ دار نہیں۔

امارت شرعیہ کے نائب امیر شریعت اور جمعیت علمائے ہند کے بہار یونٹ کے صدر مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد (۱۸۸۰-۱۹۴۰ء) نے نومبر ۱۹۳۹ء میں کانگریس کو ایک خط لکھا، اس میں کانگریس اور مسلمانوں کے بڑھتے فاصلوں کو ترجیح کے ساتھ دیکھنے کی درخواست کی گئی تھی، مسلم تعلقات عامہ کی بنیاد پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے صاف طور پر کہا تھا کہ صرف عوامی رابطہ ہونا چاہیے، یہاں ہندو عوام سے رابطہ، عیسائی عوام سے رابطہ، سکھ عوام سے رابطہ جیسی کوئی چیز نہیں، انہوں نے کانگریس پر لاتعداد غلطیوں کا الزام عائد کیا۔

انتخابی شکست کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ کانگریس کے اندر دائیں بازو کے عناصر نے اس پرچے کی سختی سے مذمت کی جس میں ان کی سیاسی بالادستی کو حکم عدولی مل سکتی تھی، ہر مسلم عوامی رابطہ کے ساتھ دائیں بازو کے کانگریسیوں کو ہندو کانگریس میں مسلمانوں کی بڑھتی تعداد کا سامنا کرنا پڑا۔

ضلع کانگریس کمیٹیاں خاموش پڑی رہیں، کانگریس میں مسلم مخالفت والے لوگ زیادہ تر صوبائی اور ضلع کمیٹی کے ہیڈ تھے، ان کا ایک پاؤں ہندو مہا سبھا میں رہتا تھا، کچھ لوگ فرقہ وارانہ فسادات میں بھی ملوث تھے، ان لوگوں نے بڑی چالاکی سے عوامی رابطہ مہم کے فنڈ کو کمزور کر دیا۔

اس طرح عوامی رابطہ کی مہم کو ختم کرتے ہوئے کانگریس نے جناح کو بڑھتی فرقہ وارانہ کشیدگی

سے فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کیا، مسلمانوں کا علاحدگی پسندی کی طرف منتقل ہونا آسان ہوگیا، کے۔ ایم۔اشرف (۱۹۰۳-۱۹۶۲ء) نے اسے یوں درج کیا ہے ''کانگریس کی اس ناکامی کی وجہ سے مسلم لیگ راتوں رات ایک مکمل منظم طاقت بن کرابھری''۔

جے پرکاش نارائن (۱۹۰۲-۱۹۷۹ء) نے بھی اپنے ''فرقہ وارانہ سول نوٹ'' میں کچھ ایسا ہی کہا تھا، انہوں نے مشورہ دیا کہ کانگریس کو کچھ اہم اقدامات اٹھانے چاہئیں، مثلاً مسلمانوں کی معاشی اصلاح کے لیے کام کرنا، کانگریس کمیٹی میں ان کی نمائندگی طے کرنا، سرکاری نوکریوں میں حصہ داری طے کرنا اور قوم پرست مسلمانوں کی حمایت کرنا، سردار پٹیل نے بھی راجندر پرساد کو ۱۵/اکتوبر ۱۹۳۸ء کو لکھے اپنے ایک خط میں اسی طرح کے جذبات کا اظہار کیا تھا، لارڈ واویل نے بھی سر اینڈ یوکلو (گورنر بمبئی) کو ۷/اکتوبر ۱۹۴۶ء کو لکھا کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کی شکایت معاشی و سیاسی وجوہات سے تھی، صرف ۱۹۴۶ء کی لیگ کی انتخابی کامیابی نے پاکستان کو عملی شکل نہیں دی، پاکستان کو حقیقت بنایا نوآبادیاتی حکمرانوں نے، فرقہ پرستی کی طرف سے حمایت اور حوصلہ ملا، بنگال میں لیگ کی طرف سے براہ راست اقدام کے نتیجے میں ہندوؤں کے خلاف بھاری خونریزی ہوئی، اس کے ردعمل میں بہار کے ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام ہوا، بہت سے لوگ بے گھر اور بنگال جانے پر مجبور ہوگئے، یہی وہ جبری منتقلی تھی جس نے لیگ کی سازشوں کو کامیاب بنایا، بہار میں سب سے زیادہ حیران کن اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ کانگریس نہ صرف فسادات کی بھیڑ کو آگے بڑھانے میں شامل تھی بلکہ رہنمائی بھی کررہی تھی، گاندھی کے سامنے کچھ کانگریسیوں نے بھی فسادات میں ملوث ہونے کا اعتراف کیا۔

مسلم لیگ یہ بھی جانتی تھی کہ انتخابی فتوحات کے باوجود کم از کم بہار میں وہ عوامی سطح پر تعاون حاصل کرنے میں ناکام رہے گی، لہٰذا لیگ اس بات کو لے کر فکرمند تھی کہ مسلمانوں پر کس طرح اضافی گرفت بنائی جائے، ستمبر، اکتوبر ۱۹۴۶ء کے بعد ہی (جب فسادات شروع ہوئے) لیگ نے اپنی فرقہ پرست سیاست کے لیے فسادات کا سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا، اگرچہ بہار کے مہاجروں کے بنگال کی طرف جانے میں لیگ کا کوئی ہاتھ بھلے ہی نہ ہو لیکن اکسانے میں ضرور تھا، بنگال میں لوگوں سے مفت زمین اور گھروں کا وعدہ کیا گیا تھا، یہاں تک کہ لوگوں نے ان علاقوں کو بھی خیرباد کہہ دیا جو نسبتاً زیادہ پرامن تھے، لیگ کے کارکنان بہار میں امداد اور تعاون کے لیے سرگرم تھے، دوسری طرف

سردار پٹیل (۱۹۵۰-۱۸۷۵ء) نے بہار میں کسی بھی طرح کی امداد اور تعاون دینے سے صاف انکار کر دیا، انہوں نے گاندھی کی مسلمانوں کی مدد اور اعتماد کی بحالی کے لیے پارٹی کی تجویز کو یکسر مسترد کر دیا، انہوں نے تو یہاں تک کہا کہ بہار میں کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔

بہار میں کانگریس اور اکثریتی فرقہ پرستی: اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ کانگریس ۱۹۴۷ء سے کئی دہائی قبل بہار میں ہندو طرز پر کافی حد تک فرقہ پرست ہو چکی تھی، وائسرائے کا یہ پختہ خیال تھا کہ یو پی اور بہار میں ہونے والے فرقہ وارانہ قتل و غارت گری کے لیے کانگریس کی نچلی سطح کی قیادت ذمہ دار ہے، فسادات بے شک طے شدہ تھے، کانگریس کارکنان کے ذریعہ طے شدہ بھی تھے، بہار کانگریس کے ایک رکن ایچ۔پی۔چندر نے راجندر پرساد کو لکھا کہ گاؤں میں ہندوؤں کے ہجوم نے قتل و غارت کو انجام دیا، لوگ وہی کام کر رہے تھے جو کانگریس قائدین نے نواکھالی (موجودہ بنگلہ دیش) کے بعد ان سے کرنے کو کہا تھا۔

نہ صرف یہ بلکہ گاندھی کی انکوائری کمیٹی کی تقرری کی تجویز کو بھی بہار حکومت نے ۱۳ر فروری ۱۹۴۷ء کو کافی دیر اور ہچکچاتے ہوئے منظور کیا تھا، سید محمود نے گاندھی کو لکھا کہ فسادات کے چار ماہ بعد بھی عدم اعتماد اور خوف کا ماحول ہے، لوگوں کے دلوں سے خوف کو دور کرنا ہی سب سے بڑا جرأت مندانہ فعل تھا، انہوں نے بھی واضح طور پر کہا تھا کہ وہ کانگریس ہی کے ممبر تھے جنہوں نے نواکھالی کا بدلہ لینے کا مطالبہ کیا تھا، تقی رحیم (۱۹۲۱-۹۹ء)، (ہم عصر اردو مصنف و سیاسی کارکن) نے سید محمود کے خط کے موضوعات کی تصدیق کرتے ہوئے یاد دلایا ہے کہ کانگریسی اخبار روزنامہ سرچ لائٹ سمیت زیادہ تر اخبارات نے فرقہ وارانہ تشدد کو مزید ہوا دی۔

سید محمود کے خط (۱۶، ۱۷ر فروری ۱۹۴۷ء) کے جواب میں ۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو گاندھی بذات خود پٹنہ نمودار ہوئے، اس واقعہ نے کانگریس کی شمولیت کو اور بھی واضح کر دیا، متاثرہ علاقوں میں گاندھی کے پیدل جانے پر کانگریس وزرا نے احتجاج کیا، بہار میں جانچ کمیٹی کے تشکیل دینے میں کانگریس کی دلچسپی سے گاندھی نالاں تھے، بہار کے وزیر اعلیٰ سری کرشن سنہا کو اس بات سے دو دفعہ آگاہ کیا گیا تھا لیکن وہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ اگر حکومت جانچ کمیٹی تشکیل دینے کی طرف بڑھ گئی تو لیگ اس کا سیاسی فائدہ اٹھائے گی، (سنہا نے یقین دلایا تھا کہ ڈیوڈ عذرا دوبین (۱۸۹۳-۱۹۷۶ء) پٹنہ ہائی

کورٹ کے موجود جج کی سربراہی میں ایک جانچ کمیٹی تشکیل دی جائے گی) گاندھی نے اس کی علاوہ یہ بھی تجویز پیش کی تھی کہ سید محمود کو امداد اور تعاونی کاموں کا سربراہ مقرر کیا جائے لیکن وزرا نے دوبارہ اسے مسترد کر دیا۔

چنانچہ ایسی ہی وجوہات نے بہار کے مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ بہار کانگریس سمیت عام ہندو مسلمانوں کو ایک علاحدہ ملک کے زمرہ میں سمجھنے لگے ہیں، ۱۹۴۶۔۴۷ء تک جیسا کہ گاندھی جی کہتے ہیں ہندو بھی تقسیم چاہتے تھے، یہ کیفیت تو ایک وقت مسلمانوں کے دل و دماغ پر چھائی رہی ،قوم پرست مسلمانوں کے لیے تقریباً یہ ناممکن ہوگیا تھا کہ وہ مسلم لیگ کو درکنار کر سکیں، ۱۹۴۶ء کے بہار فسادات نے آخر کار غیر منقسم ہندوستان کے خواب کو تباہ و برباد کر دیا،فسادات کے بعد ان تنظیموں نے امداد اور تعاونی کاموں کے ساتھ لوگوں کو راضی کرنے اور یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ کہیں اور منتقل نہ ہوں، ۶/ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو امارت شرعیہ کے ترجمان نقیب کے ایک اداریہ نے لیگ کے دوقومی نظریہ کے خلاف بحث کا آغاز کیا اور متحدہ قومیت یا مشترکہ ثقافت پر اپنے یقین کو دہرایا۔

الختصر یہ کہ بھارت کا بٹوارہ مقابلہ جاتی فرقہ پرستانہ سیاست کی وجہ سے ہوا،نو آبادیات سے پہلے ہندوستان میں کوئی فرقہ پرستانہ سیاست نہیں تھی ،موقع پرستانہ سیاست کے اس کھیل میں مسلمانوں کو تقسیم ہند کے لیے ذمہ دار ٹھہرانا صریحاً غلط ہوگا بلکہ اس کو صحیح تاریخی پس منظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔

(یہ مضمون پروفیسر محمد سجاد کی کتاب Muslim Politces in Bihar: Changing Contours, Routled 2014/2018 (Reprint) کے چوتھے باب سے ماخوذ ہے۔)

اغیار کے حقوق

(سید مودودیؒ اور ایم ایس گولوالکر کے افکار کا تقابلی مطالعہ)

جناب خان یاسر

"یہ میرا حق ہے!"، "دستور ہمیں اس حق کی ضمانت دیتا ہے!"، "یہ ہمارے حقوق کے خلاف ورزی ہے!"، "اپنے حق کے حصول کے لیے ہم عدالت تک جائیں گے!" وغیرہ جملے اکثر کانوں سے ٹکراتے ہیں۔ اخبار، ٹی وی، اور سوشل میڈیا سے لے کر چائے خانوں اور گھروں تک گفتگو اور مباحثوں میں مختلف قسم کے حقوق کا تذکرہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ اخلاقی تعلیمات سے ذرا اوپر اٹھ کر بات کریں تو حقوق دراصل نام ہے ایک ایسے ادارہ جاتی نظام کا جہاں افراد کے مفادات کو قانونی تحفظ حاصل ہو، انھیں اختیار کی قانونی آزادی اور قانون کے مطابق مواقع میں مساوات حاصل ہو۔(۱) حقوق کے علمی و فکری تصور اور عالمانہ مباحث سے واقفیت ایک الگ چیز ہے لیکن آج شاید ہی کوئی ایسا ہو جو حقوق (Rights) کی بنیادی حقیقت سے نا آشنا ہو۔ البتہ حیرت کی بات یہ ہے کہ حقوق کا یہ تصور، جسے آج عرف عام کی حیثیت حاصل ہے، قدیم نہیں ہے۔ قدرے احتیاط ملحوظ رکھی جائے تو بھی کہنا ہوگا کہ دور جدید کی علمی دنیا، جس کے تمام تر تصورات کا منبع نشاۃ الثانیہ کا تفکیری سرمایہ ہے، سترہویں صدی کے انگریز فلسفی جان لاک سے قبل انسانی حقوق کے تصور سے نا آشنا تھی۔(۲) یہ الگ بات ہے کہ کھینچ تان کر انسانی حقوق کی داستان آجکل میگنا کارٹا سے شروع کی جاتی ہے۔ حالانکہ ۱۲۱۵ میں بادشاہ اور باغی امرا کے درمیان ہونے والے اس معاہدے کا انسانی حقوق سے تعلق بس واجبی ہی سا ہے، اس کے باوجود یہ معاہدہ اپنی اصل شکل میں صرف سال بھر ہی جاری رہ سکا۔ اس کے برعکس ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے میثاق مدینہ کا دنیا کے پہلے تحریری دستور اور خطبۂ حجۃ الوداع کا حقوق انسانی کے منشور اعظم کے طور پر تعارف کرایا ہے(۳) اور ثابت کیا ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں انسانیت نے صدیوں پہلے

ریسرچ اسکالر، پولیٹکل سائنس ڈپارٹمنٹ، دہلی یونیورسٹی۔

وہ منزل پالی تھی جس کے کچھ پڑاؤں تک وحیٔ الٰہی سے غافل دنیا گرتے پڑتے اور نہ جانے کتنی ہی قربانیاں دے کر پہنچی ہے۔ اپنی مثبت شقوں کے حوالے سے دیکھیں تو اقوام متحدہ کی جانب سے ۱۹۴۸ء میں منظور شدہ حقوق انسانی کا عالمی منشور خطبۂ حجۃ الوداع کا چربہ معلوم پڑتا ہے۔

اس مقالے کا موضوع حقوق انسانی کے اسلامی تصور کا بیان یا مغرب کے تصورِ حقوقِ انسانی پر تنقید نہیں ہے۔(۴) یہاں اقوامِ غیر کے حقوق پر مولانا مودودی اور گولوالکر کے افکار کی روشنی میں اسلام اور ہندوتو کا تقابلی مطالعہ پیش نظر ہے۔ مقالے کی ضخامت کو متوازن رکھنے کے لیے بحث کو حتی الامکان مولانا مودودی کے مختصر رسالے ''اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق'' اور گولوالکر کی کتاب We or Our Nationhood Defined تک سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مصنّفین کا تعارف: سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۷۹ء۔۱۹۰۳ء) کو دور حاضر میں فکر اسلامی کے ایک شارح وترجمان کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کا لٹریچر مغربی تہذیب کے استیلا کے نتیجے میں جدید تعلیم یافتہ طبقے میں پیدا شدہ احساس کمتری کا عمدہ علاج ہے۔ مولانا مودودی نے دور جدید کے افکار ونظریات کو اسلام کی کسوٹی پر پرکھا اور ان کے مثبت ومنفی ہر دو پہلو کا ناقدانہ تجزیہ کیا۔ دور حاضر کے عقلی وسائنسی رجحانات کی مناسبت سے اسلام کی تعبیر وتشریح کا کام بھی بخوبی انجام دیا۔ اس ناحیہ سے ان کی تفسیر تفہیم القرآن کے علاوہ الجہاد فی الاسلام، پردہ، تنقیحات، حقوق الزوجین، اسلام اور ضبط ولادت، اور اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی وغیرہ خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں اقامت دین کے نصب العین کو سامنے رکھتے ہوئے انھوں نے جماعت اسلامی کے نام سے ایک تحریک قائم کی جس کے عالمی اثرات مرتب ہوئے۔ یہ تحریک آج بھی اسلامی اصولوں اور پرامن وتعمیری ذرائع کا استعمال کرکے برصغیر اور دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف حالات میں آزاد نظم وقیادت کے ذریعہ بنائے گئے لائحہ عمل کے مطابق اپنے نصب العین کے حصول کے لیے کوشاں ہے۔

مادھو سدا شیو گولوالکر (۱۹۷۳ء۔۱۹۰۶ء) راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (RSS) کے دوسرے سرسنگھ چالک تھے۔ سنگھ پریوار میں آر ایس ایس کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جس کی مختلف تنظیموں، این جی اوز اور اداروں کی شکل میں، ہزارہا شاخیں ہیں۔ ان میں بی جے پی، وی ایچ پی، اے بی وی پی، بی ایم ایس، اور بجرنگ دل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ گولوالکر بھلے آر ایس ایس کے بانی نہیں ہیں

لیکن سنگھ پر انھوں نے بانی کیشو بالی رام ہیڈ گیوار سے زیادہ اثرات مرتب کیے۔آر ایس ایس میں ان کی حیثیت صرف ایک قائد کی نہیں بلکہ نظریہ ساز کی ہے۔سنگھ کے حلقوں میں انھیں محبت واحترام سے گروگولوالکر کہا جاتا ہے۔گولوالکر نے ۱۹۴۰ء سے آر ایس ایس کی کمان سنبھالی اور اپنی وفات تک اس منصب پر فائز رہے۔اس دوران انھوں نے ہندوستان بھر میں آر ایس ایس کی توسیع کا کام منظم انداز میں کیا۔ان کی تحریروں اور تقریروں کو سنگھ کے حلقوں میں حرف آخر کی حیثیت حاصل ہے۔

منتخبہ کتب کا تعارف: ''اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق'' چار ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں غیر مسلم رعایا کی اقسام کا تذکرہ ہے۔اس میں مولانا مودودی (۵:۱۹۹۳ء) نے فقہ کی روشنی میں بتایا ہے کہ اسلامی قانون کی رو سے غیر مسلم رعایا کی تین قسمیں ہوسکتی ہیں۔ اول، جو معاہدے کے ذریعہ، دوم، جو شکست کھا کر، اور سوم، جو صلح اور جنگ کے علاوہ کسی اور طریقے سے اسلامی ریاست میں شامل ہوئے ہوں۔ باب دوم میں ذمیوں کے عام حقوق کا تذکرہ ہے۔اس سے مراد وہ کم از کم حقوق ہیں جن میں تینوں اقسام کے غیر مسلم شریک ہیں۔(۵) باب سوم میں مختصراً اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ غیر مسلموں کے یہ حقوق صرف کتابوں کی زینت نہیں بنے بلکہ اسلامی تاریخ کے ہر دور میں عملی طور پر تسلیم کیے گئے ہیں۔ان استثنائی صورتوں میں جب ذمیوں کے کسی گروہ کے ساتھ ناانصافی ہوئی تو علما وفقہائے اسلام ان حقوق کی پاسداری کے لیے آگے آئے۔ باب چہارم میں مولانا مودودی نے دورِ حاضر اور اس کے تقاضوں کے پیش نظر ان زائد حقوق کا تذکرہ کیا ہے جو غیر مسلموں کو ایک جدید اسلامی ریاست میں دیے جاسکتے ہیں۔

We or Our Nationhood Defined گولوالکر کی بڑی مشہور (یا بدنام) کتاب ہے جو ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی، کتاب ہندو قوم پرستی کی تعریف متعین کرنے کی سعی ہے۔ ساورکر کی Hindutva: Who is a Hindu? کے ساتھ اس کتاب کو ہندوتو تحریک کی بائبل کہا جاسکتا ہے، کتاب کے پیش لفظ میں ہی گولوالکر یہ صاف کر دیتے ہیں کہ وہ قوم (Nation) کو ایک تہذیبی اکائی اور ریاست (State) کو سیاسی اکائی کے طور پر دیکھتے ہیں اور ان کے مطابق ہندوستان میں اگر لفظ نیشن بغیر کسی سابقے کے بولا جائے گا تو اس سے صرف اور صرف ہندو قوم مراد ہوگی۔ پیش لفظ، دیباچہ اور خاتمہ کے علاوہ کتاب میں مادھو شری ہری انے کا مقدمہ اور جے سنگھ کو لکھے گئے شوا کے خط اور ولیم

ویڈربرن کے (انڈین نیشنل کانگریس کے تشکیلی عوامل سے متعلق) ایک اقتباس پر مبنی دو ضمیمے بھی شامل ہیں۔ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ہندو قوم کی قدامت پر بحث کی گئی ہے۔(۶) باب دوم میں گولوالکر نے مغربی مفکرین کے حوالے سے نیشن کے تصور کی توضیح کی ہے اور کسی قوم کی تشکیل میں پانچ عناصر یعنی جغرافیہ، نسل، مذہب، تہذیب اور زبان کے اشتراک کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے نیز یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان پانچ عناصر کی یکسانیت قومیت کی تشکیل کے لیے ناگزیر ہے۔ باب سوم میں جنگ عظیم اول کے بعد پیدا شدہ حالات میں مختلف قوموں کی مثالوں کی روشنی میں گولوالکر نے اس بات کو موکد کیا ہے کہ زندہ قومیں ان پانچ عناصر میں چھیڑ چھاڑ گوارا نہیں کرتیں اور ان میں سے کسی ایک یا زائد پر سمجھوتے کا مطلب قوم کا اپنی قومیت سے ہاتھ دھولینا ہے۔ باب چہارم میں گولوالکر نے قومیت کی اس تعریف کا ہندوستان پر انطباق کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہندوستان میں ہندو نسل، ہندو مذہب، ہندو تہذیب اور ہندو زبان قومیت کے لیے شرط لازم ہے۔ باب پنجم میں گولوالکر اقلیتوں اور غیر ہندو اقوام کے بارے میں بحث کرتے ہیں کہ ملک میں ان کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا جانا چاہیے۔ باب ششم میں راشٹر، جاتی، جنپد وغیرہ کے حوالے سے گولوالکر نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوؤں میں قومیت کا تصور مغرب سے مستعار نہیں ہے بلکہ پہلے سے موجود تھا۔ باب ہفتم اس سوال کے جواب پر مشتمل ہے کہ ہندوؤں میں قومیت کا تصور اگر قدیم ہے تو وہ کیوں معدوم ہوگیا۔

اس کتاب میں گولوالکر نے 'وی' یعنی 'ہم' کی تعریف بیان کرنے کی کوشش میں 'غیروں' کی شناخت بھی کی ہے اور جا بجا اس بات پر بحث کی ہے، بالخصوص باب پنجم میں، کہ غیروں کے ساتھ ملک کی 'اصلی قوم' کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ آئندہ سطروں میں غیر متعلق بحثوں سے صرف نظر کرکے اسی موضوع پر مرکوزیت کے ساتھ تقابلی جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

اغیار کے حقوق ۔ تقابلی مطالعہ: مولانا مودودی نے اپنے لٹریچر میں اس بات پر خاصا زور دیا ہے کہ اسلام عام معنوں میں ایک مذہب نہیں ہے نہ مسلمان عام معنوں میں ایک قوم ہیں۔ انھوں نے نسل، وطن، زبان اور قومیت کے دیگر عناصر پر گفتگو کرتے ہوئے ان کی بنیاد پر بننے والی قومیتوں کو ایک طرف ناپائیدار اور دوسری طرف فتنہ انگیز قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق اسلام میں قومیت ان اتفاقی بنیادوں پر نہیں بلکہ ایمان کی شعوری بنیاد پر بنتی ہے۔(۷) کسی مخصوص نسل، وطن، تہذیب یا زبان کی

بنیاد پرنہیں بلکہ نظریۂ اسلام پر ایمان نہ لانے کی بنا پر غیر مسلم اسلامی قومیت کا حصہ نہیں بنتے۔

قومیت اسلام کا حصہ نہ بننے کے باوجود ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو مختلف قسم کے حقوق و مراعات حاصل ہوتی ہیں۔ مولانا مودودی (۱۱: ۱۹۹۳ء) کے مطابق انھیں حفاظت جان کا حق (Right to life) حاصل ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں، ''ذمی کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر ہے۔ اگر کوئی مسلمان ذمی کو قتل کردے گا تو اس کا قصاص اسی طرح لیا جائے گا جس طرح مسلمان کو قتل کرنے کی صورت میں لیا جاتا ہے۔'' انھوں نے تاریخی شواہد کی روشنی میں بتایا ہے کہ کس طرح اس اصول کا اطلاق ہوتا رہا ہے۔ مولانا مودودی (۱۴-۱۳: ۱۹۹۳ء) مزید لکھتے ہیں کہ غیر مسلموں کو اسلامی ریاست میں تحفظ عزت (Right to dignity) کا حق حاصل ہوتا ہے اور انھیں زبان یا ہاتھ پاؤں سے تکلیف پہنچانا قابل مواخذہ جرم ہے۔ اسی طرح دیوانی و فوجداری قانون مسلم و غیر مسلم کے لیے یکساں ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں کوئی تفریق روا نہیں رکھی جاتی۔ علاوہ ازیں غیر مسلموں کو اپنی علاحدہ مذہبی شناخت پر قائم رہنے اور پرسنل لا پر عمل کرنے کی آزادی ہوتی ہے۔ مولانا مودودی (۱۷-۱۶: ۱۹۹۳ء) لکھتے ہیں، ''ذمیوں کے شخصی معاملات ان کی اپنی ملت کے قانون (Personal Law) کے مطابق طے کیے جائیں گے۔ اسلامی قانون ان پر نافذ نہیں کیا جائے گا۔ ہمارے لیے شخصی معاملات میں جو کچھ ناجائز ہے، وہ اگر ان کے مذہبی و قومی قانون میں جائز ہو تو اسلامی عدالت ان کے قانون ہی کے مطابق فیصلہ کرے گی۔'' یعنی اس ضمن میں غیر مسلموں کو وہ حقوق بھی حاصل ہوں گے جو ایک اسلامی ریاست میں مسلمانوں کو بھی نہیں ہوں گے ان میں شراب نوشی، شراب و خنزیر کی خرید و فروخت، اور محرمات کے ساتھ نکاح وغیرہ شامل ہے۔ اسی طرح غیر مسلموں کو اپنی بستیوں میں اپنے مذہبی مراسم و قومی شعائر کو اعلان و اظہار کے ساتھ ادا کرنے کی آزادی ہوگی۔ مولانا مودودی (۲۶-۲۰: ۱۹۹۳) مزید بیان کرتے ہیں کہ غیر مسلموں پر عائد جزیہ کے سلسلہ میں ان پر سختی نہیں کی جاسکتی۔ اس کی ادائیگی کے لیے ان کے املاک کی نیلامی نہیں ہوسکتی۔ حتی یہ کہ غیر مسلموں میں سے جو فقیر، محتاج اور بوڑھے ہوں ان کے لیے اسلامی حکومت بیت المال سے وظائف مقرر کرے گی۔ کوئی فرد جزیہ بقایا چھوڑ کر مر جائے تو اس رقم کو تر کہ سے وصول نہیں کیا جائے گا نہ ہی وارثوں پر اس کا بار ڈالا جائے گا۔ ذمی فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہوں گے۔ اگر وہ خود اپنی خدمات پیش کریں تو اسے قبول کیا

جا سکتا ہے لیکن اس صورت میں ان کا جزیہ ساقط کرنا ہوگا۔ بالفرض محال کوئی ایسا وقت آیا جب ذمیوں کی حفاظت نہ کی جاسکے تو اسلامی ریاست کو جزیہ کی رقم لوٹانی ہوگی۔(۸)

مولانا مودودی نے اسلام کے ان قوانین کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مختصراً تاریخی شواہد بھی بیان کیے ہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اسلام کے یہ زریں اصول صرف کتابوں کی زینت نہ تھے بلکہ ان پر حقائق کی دنیا میں عمل ہوتا تھا۔

گولوالکر کی تعریف کے مطابق ہندوستان میں برسہا برس سے رہنے کے باوجود وہ تمام لوگ 'غیر' ہیں جو ہندو نسل، ہندو مذہب، ہندو تہذیب اور ہندو زبان سے متعلق نہیں ہیں۔ ان میں سے جن لوگوں کو اپنی اس علاحدہ شناخت کا شعور اور احساس بھی ہے، اس پر فخر بھی ہے، اور اسے باقی رکھنے پر اصرار بھی تب تو ان کے غیر ہونے میں کوئی شبہہ نہیں ہے۔ یوں ان کی نظر میں مسلمان خصوصیت کے ساتھ غیر ہیں۔ ایک دوسری جگہ پر گولوالکر نے مسلمانوں کو (عیسائیوں اور کمیونسٹوں کے ہمراہ) ملک کے لیے اندرونی خطرہ (internal threat) بھی بتایا ہے۔(۹)

گولوالکر (۱۹۳۹:۱۱-۱۲) کی نظر میں مسلمان بنیادی طور پر بیرونی حملہ آور ہیں۔ ان کے مطابق جس منحوس دن سے مسلمان ہندوستان آئے تبھی سے ہندو ان کے خلاف برسرپیکار ہیں۔ یوں ہندوؤں نے ان بیرونی حملہ آوروں کے خلاف آٹھ سو سے ہزار سال تک ایک طویل جنگ لڑی اور بالآخر فتحیاب ہوئے۔ لیکن عین اس وقت جب اس فتح کے ثمرات مکمل طور پر ظاہر ہوتے مسلمانوں کی سازش سے انگریز ملک پر غالب آ گئے۔ گولوالکر (۱۹۳۹:۱۴) کے مطابق مسلمان اپنے آپ کو فاتح ہی سمجھتے ہیں اور ان کا مقصد زیادہ سے زیادہ طاقت کا حصول ہے۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں مسلم اقلیت کے مسئلے کا یہ حل نہیں ہے کہ مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کر کے انہیں قومیانے کی کوشش کی جائے۔ گولوالکر کی رائے میں مسلمانوں کو برابر کا شہری سمجھنا، اقلیتوں کی حیثیت سے انہیں خصوصی حقوق دینا، ان کے خدشات کو اہمیت دینا اور ان کے مطالبات کو تسلیم کرنا ہندوؤں کے لیے قومی خودکشی کے مترادف ہے۔ اس سے صرف مسلمانوں کی طاقت کی بھوک میں اضافہ ہوگا۔

اگر ایسا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقلیتوں کے مسئلے کا صحیح حل کیا ہے؟ اپنی کتاب میں گولوالکر اس سوال پر بہت گہرائی سے غور کرتے ہیں۔ انھوں نے اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ زندہ قومیں

اس مسئلے کو کس طرح حل کرتی ہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے برطانیہ کی مثال پیش کی ہے۔ یہاں گولوالکر (۱۹۳۹:۳۳-۳۴) نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ برطانیہ اپنی نسل، تہذیب، مذہب اور زبان کا محافظ ہے۔ ان کے مطابق نسل اور تہذیب کے بارے میں تو کوئی شک نہیں لیکن جدید دور میں مذہب اور زبان کے تعلق سے بہت سے سوال اٹھے ہیں لہذا انھوں نے خصوصیت سے برطانیہ کا ان دو نکات پر جائزہ لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ برطانیہ میں مذہبی غیر جانبداری کے تمام دعاوی کے باوجود ریاستی مذہب کا تصور پایا جاتا ہے۔ بادشاہ کے لیے پروٹسٹنٹ عیسائی ہونا ایک لازمی شرط ہے۔ چرچ آف انگلینڈ کو ریاست سے تنخواہیں اور مراعات حاصل ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ کلکتہ میں بشپ کا خرچ بھی سرکار اٹھاتی ہے۔ ہندوستان میں مشنری سرگرمیاں سرکار کی سرپرستی میں انجام دی جاتی ہیں۔ اسی طرح برطانیہ کی جانب سے تاریخ کے ہر دور میں انگریزی زبان کے پھیلاؤ کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ آئرلینڈ، ویلس یا ہندوستان ہر جگہ انگریزی زبان کو مقامی زبانوں کی قیمت پر فروغ دیا گیا ہے۔ دوسری مثال گولوالکر (۱۹۳۹:۳۴-۳۶) جرمنی کی دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ قومیت کے حقیقی تصور کو سمجھنے کے لیے جدید جرمنی کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ گولوالکر اس جذبے کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں جس سے مغلوب جرمنی نے ایک اور عالمی جنگ شروع ہوجانے کے خدشے کے علی الرغم ان زمینوں کو حاصل کرنے کی کوشش کی جن پر تاریخی طور پر ان کا حق تھا؛ گولوالکر کے مطابق یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انھیں اپنے فادر لینڈ اور آبائی وطن پر کیسا فخر ہے۔ جرمنی کے ان استعماری عزائم کو گولوالکر نے فطری و منطقی آرزو (natural and logical aspiration) قرار دیا ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ جرمنی میں ریاستی زبان جرمن ہے۔ عوامی زندگی میں اقلیتیں اسی زبان کا استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ مذہب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جرمنی میں صدر ریاست خالص مذہبی نوعیت کا عہد لیتا ہے، اسی طرح سرکاری چھٹیاں بھی عیسائی مذہب کے رومن کیتھولک فرقے کے تہواروں کی مناسبت سے دی جاتی ہیں۔ نسل کے عامل پر گولوالکر عقیدتمندی سے لکھتے ہیں کہ جرمنی نے اپنی نسل اور تہذیب کی بقا کے لیے یہودیوں کا قتل عام کرکے پوری دنیا کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔ ان کے مطابق اس عمل کے ذریعہ جرمنی نے اپنے نسلی افتخار کا اظہار کیا ہے۔ جرمنی کی اس مثال سے گولوالکر اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ مختلف نسلوں اور تہذیبوں کا ایک ساتھ رہنا ناممکن ہے اور صاف لفظوں میں لکھتے ہیں کہ

جرمنی کی اس مثال میں ''ہندوستان کے لیے سیکھنے اور فائدہ اٹھانے کے لیے ایک اچھا سبق ہے۔''
حیران کردینے والی بات یہ ہے کہ سامی نسلوں (جن میں یہودی شامل ہیں) کے قتل عام کو جائز ٹھہرانے سے پہلے گولوالکر (۲۰۔۱۹۳۹:۱۹) یہودیوں کے قومی جذبے کی توصیف کرچکے ہیں کہ یہودیوں کو پہلے رومن اور بعد میں مسلمانوں کے ظلم سے تنگ آکر اپنا وطن چھوڑنا پڑا مگر انھوں نے اپنے مذہب، تہذیب، زبان اور نسل کی حفاظت کی اور آخرکار فلسطین میں اپنا وطن بنانے کی طرف معنی خیز پیش رفت کررہے ہیں۔(۱۰) اس ضمن میں گولوالکر (۳۷۔۱۹۳۹:۳۶) روس کی مثال بھی پیش کرتے ہیں کہ اپنے تمام ترکمیونسٹ دعوؤں کے باوجود روس ایک آرتھوڈوکس ملک ہے جہاں پرانی روسی نسل آباد ہے اور روسی زبان بولی جاتی ہے۔ البتہ سوشلزم کو ایک نئے مذہب کے طور پر قبول کرلیا گیا ہے۔ یعنی قومیت کے تمام عوامل یہاں بہرحال موجود ہیں۔ اقلیتوں کے مسئلے پر بات کرتے ہوئے وہ اس بات پر زور ڈالتے ہیں کہ روس میں جو بھی سوشلزم کی مخالفت کرتے ہیں ان کے ساتھ کسی قسم کی رواداری نہیں برتی جاتی۔

قصہ مختصر یہ کہ گولوالکر (۴۵۔۱۹۳۹:۴۳) کے مطابق ہندوستان میں ہندو نسل، ہندو مذہب، ہندو تہذیب، اور ہندو زبان (سنسکرت کے خاندان سے متعلق زبانیں اور اس کی شاخیں) قومیت کے تصور کی تکمیل کرتی ہیں۔ جو بھی ہندو نسل، مذہب، تہذیب اور زبان سے تعلق نہیں رکھتا وہ ہندوستانی قوم کا حصہ نہیں ہے۔ محب وطن اور خیرخواہ قوم وہی ہے جو ہندو نسل اور قوم کو فروغ دینے کی کوشش کرے۔ اس کے علاوہ جو ہیں یا تو باغی دشمن ہیں یا بیوقوف۔ قوم کی اس خودساختہ تعریف سے جو باہر ہو اس کے لیے ملک کی قومی زندگی میں کوئی جگہ نہیں ہے جب تک کہ وہ اپنی علاحدہ شناخت کو ترک کرکے قوم کے مذہب، تہذیب اور زبان کو اپنا کر قومی نسل میں ضم نہ ہوجائے۔ جب تک وہ اپنی علاحدہ نسلی، مذہبی، وتہذیبی شناخت پر قائم رہتے ہیں ان کی حیثیت غیر ملکی کی ہوگی۔

یوں گولوالکر (۱۹۳۹:۴۷) اقلیت کو ایک مسئلہ کے طور پر دیکھتے ہیں۔ مختلف ملکوں کی مثالیں دے کر وہ اس مسئلے کے حل کی طرف آتے ہیں۔ ان کے مطابق قدیم، زندہ اور باشعور قومیں اقلیت کے مسئلے کو جس طرح حل کرتی ہیں اس میں ہندوستان کے لیے ایک سبق ہے۔ وہ کسی بھی علاحدہ عنصر کو قوم کے سیاسی نظام میں تسلیم نہیں کرتیں۔ مہاجرین کو ان قوموں کی تہذیب وزبان اختیار کرکے، قومی عزائم کو اپنا کر اپنی علاحدہ شناخت کے شعور سے دستبردار ہوکر قومی نسل میں جذب ہوجانا پڑتا ہے۔ اگر

وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوتے تو ان کی حیثیت ایک غیر ملکی کی ہوتی ہے۔ وہ قومی نسل کے رحم وکرم پر اس کے اصولوں کے ماتحت زندگی گزارتے ہیں۔ انھیں کسی قسم کا خصوصی تحفظ حاصل نہیں ہوتا نہ ہی کسی قسم کے مراعات اور حقوق ملتے ہیں۔

گولوالکر (۴۸۔۴۷ :۱۹۳۹) یہی دو متبادل ہندوستان کے غیر ہندوؤں کے سامنے بھی رکھتے ہیں۔ پہلا متبادل اپنی علاحدہ شناخت سے دستبرداری اور قومی نسل میں مکمل انضمام کا اور دوسرا متبادل قومی نسل کے رحم وکرم پر رہنا اور جب اس کی مرضی ہو ملک چھوڑ دینا۔ اسے وہ اقلیتی مسئلے کا واحد حل قرار دیتے ہیں ورنہ، بقول گولوالکر، یہ مسئلہ کینسر کی شکل اختیار کر لے گا۔ وہ نصیحت کرتے ہیں کہ ہندوستان میں رہنے والی بیرونی نسلوں کو چاہیے کہ وہ ہندو تہذیب اور زبان کو اختیار کریں، ہندو مذہب کی تعظیم کریں، ہندو نسل اور تہذیب یعنی ہندو قوم کے علو (glorification) کے علاوہ کوئی اور خیال دلوں میں نہ لائیں اور اپنی علاحدہ شناخت سے دستبردار ہو کر ہندو نسل میں ضم ہو جائیں یا اس ملک میں ہندو قوم کے ماتحت زندگی گزاریں بغیر کسی مطالبے، بغیر کسی مراعات اور امتیازی سلوک کے۔ شہریت کے حقوق کا تو تصور بھی نہ کریں۔

اوپر مولانا مودودی کے بیان کردہ ان حقوق کا تذکرہ تھا جن کے پیچھے فقہی اصول اور تاریخی شواہد موجود تھے۔ لیکن اپنے رسالے میں مولانا مودودی نے اسلام کی اصولی تعلیمات اور مقاصد شریعت کو پیش نظر رکھ کر ان زائد حقوق کا ذکر بھی کیا ہے جو موجودہ دور میں ایک اسلامی ریاست اپنے غیر مسلم شہریوں کو دے سکتی ہے۔ اس ضمن میں مولانا مودودی (۳۴۔۳۱ :۱۹۹۳) نے غیر مسلموں کی نمائندگی کی مختلف شکلوں پر غور کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر دستور میں اس بات کی صراحت ہو کہ پارلیمنٹ قرآن و سنت کے خلاف قانون سازی کی مجاز نہ ہوگی تو ''موجودہ زمانے کے حالات میں (غیر مسلموں کی پارلیمنٹ میں شرکت کی) گنجائش نکالی جاسکتی ہے''۔ اس نمائندگی کی ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ غیر مسلموں کی علاحدہ نمائندہ مجلس ہو جہاں وہ بالکل آزادی کے ساتھ اپنے شخصی معاملات کی حد تک قوانین بنانے، ان میں ترمیم کرنے، حکومت کے نظم ونسق سے متعلق شکایات، اعتراضات، مشورے، اور تجاویز پیش کرنے علاوہ ازیں اپنے گروہی معاملات اور عام ملکی معاملات سے متعلق حکومت سے سوالات کرنے کے مجاز ہوں گے۔ پارلیمنٹ جن کی حیثیت مجالس قانون سازی کی ہوتی ہے اس میں ان کی شرکت شرطیہ اس لیے ہے کہ اسلامی ریاست ایک اصولی اور نظریاتی حکومت ہے لیکن ''جہاں تک بلدیات

اور مقامی مجالس کا تعلق ہے'' مولانا مودودی کہتے ہیں کہ ''ان میں غیر مسلموں کو نمائندگی اور رائے دہی کے پورے حقوق دیے جاسکتے ہیں۔'' اسی طرح اسلام کے اصولی نظام میں کلیدی حیثیت رکھنے والے مناصب کے علاوہ وہ ہر منصب اور ملازمت کے اہل ہوں گے۔صنعت وحرفت، تجارت، زراعت اور دوسرے تمام پیشوں کو اختیار کرنے میں وہ آزاد ہوں گے۔اس معاملے میں مسلمانوں کے لیے کوئی خصوصی رعایت یا غیر مسلموں پر کوئی خصوصی پابندی نہ ہوگی۔سبھی کو ''معاش کے میدان میں جدوجہد کا مساویانہ حق ہوگا۔'' مسلمان اور غیر مسلم میں آزادیٔ تحریر وتقریر کے معاملے میں کوئی تفریق نہ ہوگی۔قانون کی حدود میں انھیں ''حکومت پر، اس کے احکام پر اور خود رئیسِ حکومت پر آزادانہ تنقید'' اور ''مذہبی بحث ومباحثہ کی ویسی ہی آزادی ہوگی جیسی مسلمانوں کو ہے۔'' اپنے ضمیر اور عقیدے کی مکمل آزادی کے علاوہ انھیں اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرنے کی بھی آزادی ہوگی۔انھیں اسلام کی مذہبی تعلیم کے حصول کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا۔سرکاری وغیر سرکاری درسگاہوں میں وہ اپنی مذہبی تعلیم کا نظم کرنے میں آزاد ہوں گے۔

خاتمہ: اس تقابلی مطالعہ کے بعد ہم درج ذیل نتیجوں تک پہنچ سکتے ہیں۔

☆ سید مودودی اور گولوالکر دونوں مشترکہ و متحدہ قومیت کے علمبردار نہیں ہیں۔گولوالکر کے نزدیک قومیت وطن، نسل، تہذیب، مذہب اور زبان کے اشتراک کا نام ہے۔مولانا مودودی کے نزدیک قومیت کی بنیاد اسلام اور ایمانی اخوت ہے۔وطن، نسل، زبان وغیرہ عوامل کی اہمیت 'لتعارفو' کے حوالے سے ہے اور ثانوی ہے۔

☆ ملک کا نظام گولوالکر کے نزدیک قومی نسل چلائے گی اور غیر اقوام یا افراد کو قومی نسل میں شامل ہونے کے لیے اپنی علاحدہ شناخت کو کھونا ہوگا اور ہر اعتبار سے قومی نسل میں ضم ہونا ہوگا۔دوسری طرف اسلامی ریاست کو اسلام کے علمبردار چلائیں گے، اس لیے نہیں کہ وہ کسی خاص نسل یا علاقے سے تعلق رکھتے ہیں یا کوئی خاص زبان بولتے ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ اسلام کے نظریے اور مسلک پر ایمان لائے ہیں۔کسی بھی جغرافیائی خطے، نسل، مذہب، تہذیب اور زبان سے متعلق شخص جب اس نظریے اور مسلک پر ایمان کا اعلان کرے گا تو اس کے اور پشتینی مسلمانوں کے درمیان کوئی تفریق نہ ہوگی۔

☆ گولوالکر (۱۹۳۹:۴۶-۴۹) کے مطابق اغیار کے خصوصی حقوق ومراعات کا ہر مطالبہ غلط ہے۔ان مطالبات کو تسلیم کیا جائے تو ان میں اپنی طاقت اور علاحدگی پسندی کا رجحان مزید فروغ پاتا ہے

لہٰذا انھیں حقوق ومراعات دینا قومی نسل کے لیے خودکشی ہے۔اقلیتوں کا اپنی علاحدہ شناخت پر اصرار فتنے کا موجب ہے لہٰذا حقوق ومراعات کے ذریعہ اسے استحکام بخشنے کے بجائے اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ یا تو وہ قومی نسل کے رحم وکرم پر زندگی گزاریں یا ان کی حیثیت ایک غیر ملکی کی ہوگی اور ملک کے اصل باشندے یعنی قومی نسل جب مناسب سمجھے انھیں ملک کو چھوڑنا ہوگا؛ علاوہ ازیں وہ کسی قسم کے خصوصی حقوق ومراعات کی امید نہ کریں۔اس ظالمانہ رویہ کے قطعاً برعکس مولانا مودودی نے تفصیل سے ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق پر روشنی ڈالی ہے۔غیر مسلموں کو ایک اسلامی ریاست میں تحفظ جان اور تحفظ عزت کا حق مسلمانوں کی طرح حاصل ہوگا۔دیوانی وفوجداری معاملات میں بھی مساوات حاصل ہوگی۔انھیں اپنی علاحدہ شناخت قائم رکھنے اور پرسنل لاء پر عمل کرنے کا حق ہوگا۔اس ضمن میں انھیں ایسے کاموں کی اجازت بھی ہوگی جو اسلام کی رو سے حرام اور مسلمانوں کے کرنے پر قابل مواخذہ جرم شمار ہوں گے۔اسلامی حکومت چونکہ ایک اصولی حکومت ہے لہٰذا وہ حکومت کے کلیدی مناصب پر فائز نہیں ہوسکیں گے لیکن اس کے علاوہ کسی منصب اور ملازمت کو اختیار کرنے میں کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی۔وہ فوجی خدمت سے بھی مستثنیٰ ہوں گے۔مولانا مودودی فرماتے ہیں،''دشمن سے ملک کی حفاظت کرنا تنہا مسلمانوں کے فرائض میں داخل کیا گیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک اصول پر جو ریاست قائم ہو اس کی حفاظت کے لیے وہی لوگ لڑ سکتے ہیں اور انہی کو اس کے لیے لڑنا چاہیے جو اس اصول کو حق مانتے ہوں۔پھر لڑائی میں اپنے اصول اور حدود کی پابندی بھی وہی لوگ کر سکتے ہیں۔''انھیں اپنی مذہبی تعلیم کا انتظام کرنے کا حق ہوگا۔یہ انتظام وہ نجی کے علاوہ سرکاری تعلیم گاہوں میں بھی کرنے کے مجاز ہوں گے،انھیں اسلام کی مذہبی تعلیم کے حصول کے لیے مجبور نہ کیا جائے گا۔انھیں مسلمانوں کی طرح آزادیٔ اظہار رائے کا حق ہوگا جس میں اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرنا یا حکومت پر تنقید کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔ان کے جرائم پر انھیں سزا دی جائے گی لیکن اس سے ان کا ذمہ نہیں ٹوٹے گا۔مولانا مودودی (۱۵:۱۹۹۳) کے الفاظ میں،''عقد ذمہ مسلمانوں کی جانب سے ابدی لزوم رکھتا ہے،یعنی وہ اسے باندھنے کے بعد پھر اسے توڑ دینے کے مختار نہیں ہیں۔لیکن دوسری جانب ذمیوں کو اختیار ہے کہ جب تک چاہیں اس پر قائم رہیں اور جب چاہیں اسے توڑ دیں۔''

☆ الغرض گولوالکر کے ہندوراشٹر میں ہندوؤں کے علاوہ کسی دوسری قوم کا انسانوں کی طرح

رہنا محال ہے۔ گولوالکر کے نظریہ کی انتہا یہ ہے کہ اقلیتوں کے مسائل کے حل کے لیے وہ جرمنی میں یہودیوں کے قتل عام کی پذیرائی سے بھی نہیں جھجکتے۔ اس کے برعکس اسلامی ریاست میں چند اصولی باتوں کے علاوہ مسلم و غیر مسلم میں حقوق کے باب کوئی فرق نہ ہوگا، بلکہ چند مخصوص معاملات میں اپنے مذہب کے حوالے سے انھیں وہ 'حقوق' بھی حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو کسی صورت سے نہیں مل سکتے۔

اس تقابلی مطالعے کے نتیجے میں الٰہی نظام سے پیدا شدہ وسعت قلبی، وسعت ظرفی اور وسعت نظری اور وحی الٰہی سے عاری انسانی عقل کے ذریعہ بنائے گئے نظاموں کی تنگ نظری منقح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اللہ کی ہدایت ہی انسانیت کے لیے خیر و فلاح کی ضامن ہے اور اس ہدایت سے منہ موڑ کر بننے والے نظام، پھر چاہے وہ نسل، زبان، یا تہذیب کی بنیاد پر برپا ہوں یا کسی فلسفے، نظریے، مذہب اور سائنس کی موجب شر و فساد ہیں۔ اسلام کی تعلیمات اگر شفاف انداز میں سامنے آئیں تو ان میں دلوں کو فتح کر لینے کی صلاحیت ہے۔ یہ افسوس کا مقام ہے کہ جو قوم قرآن وسنت کی علمبردار ہے اس کی پڑوسی اقوام قرآن وسنت کی تعلیمات سے قطعاً نابلد، غلط فہمیوں کی شکار، اور شرک و فرقہ پرستی میں غرق ہیں۔ اس مطالعے سے یہ بات بھی اظہر من الشّمس ہوتی ہے کہ حالیہ دنوں میں حکمرانوں کی جانب سے مسلمانوں کی شہریت پر جو سوالات قائم ہوئے ہیں ان کی جڑ اور بنیاد میں کونسے عوامل اور کیسے عزائم ہیں۔

حواشی

(۱) حقوق کی تعریف و دیگر علمی بحثوں کی تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: والڈرون ۱۹۸۷ء اور راماسوامی ۲۰۱۵ء۔ (۲) انسانوں کے فطری حقوق (Natural Rights) اور ان حقوق کی پاسداری پر مبنی ایک سیاسی نظام کا تصور مغرب کے لیے اتنا نامانوس تھا کہ جان لاک نے ۱۶۸۹ء میں اپنی کتاب Two Treatises of Government کو گمنام شائع کرایا۔ (۳) ملاحظہ فرمائیں: حمید اللہ ۲۹۲: ۲۰۱۳ء اور ۱۰۱-۷۶: ۲۰۰۴ء۔ (۴) ان موضوعات پر مودودی ۲۰۱۱ء، عمری ۲۰۰۸ء اور سعید ۲۰۱۳ء کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ (۵) معاہدین کو صلح کی شرائط کی روشنی میں اس سے زیادہ حقوق حاصل ہوں گے۔ اور مفتوحین مسلمانوں کے خلاف چاہے کیسی ہی سفاکی اور سنگ دلی سے کیوں نہ معرکہ آرا ہوئے ہوں، بطور اسلامی رعایا انہیں یہ حقوق بالضرور حاصل ہوں گے۔ (۶) زمین و آسمان کے قلابے ملا کر گولوالکر اپنا پورا زور اس بات کو ثابت کرنے میں صرف کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ہندو کسی بھی بیرونی حملے سے آٹھ سے دس ہزار پہلے سے آباد چلے آرہے ہیں۔ مختلف قسم کی غیر علمی و غیر سائنسی تھیوریوں کا سہارا لے کر گولوالکر آرینوں کو

ملک کا قدیم باشندہ بتاتے ہیں اور ان کے بیرون ہند سے ہجرت کر کے ہندوستان آنے کا انکار کرتے ہیں۔ گولوالکر (۱۹۳۹:۸ء) اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آرینوں کا تعلق قطب شمالی کے علاقوں Arctic Zone سے ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ قطب شمالی کا مذکورہ علاقہ پہلے ہندوستان میں اس جگہ تھا جہاں اب بہار اور اڑیسہ ہیں۔ مختصراً یہ کہ آرین بیرون سے ہندوستان نہیں آئے بلکہ جس خطے سے ان کا تعلق تھا وہ خطہ آرینوں کو ملک میں چھوڑ کر بذات خود شمال کی طرف ہجرت کر گیا۔ گولوالکر کی کتاب اسی طرح کے مضحکہ خیز دعووں سے بھری ہوئی ہوتی تو بھی کوئی بہت زیادہ پریشانی کی بات نہ تھی لیکن کتاب میں غیر ہندو اقوام کے ساتھ جو رویہ اپنانے کی وکالت کی گئی ہے وہ خطرناک ہے۔ (۷) تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: مودودی ۱۹۷۷ء اور خان ۲۰۱۶ء۔ (۸) جزیہ کے موضوع پر مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: نعمانی ۱۹۹۹ء۔ (۹) ملاحظہ فرمائیں: گولوالکر ۲۶۵۔ ۱۹۸۰:۲۳۳ء۔ (۱۰) ۱۹۱۷ء کے بالفور اعلامیے کے بعد اس عمل میں تیزی آچکی تھی جس کی طرف گولوالکر نے اشارہ کیا ہے بعد ازاں ۱۹۴۸ء میں باضابطہ اسرائیل کا قیام عمل میں آیا۔

مراجع ومصادر:

1-Jeremy Waldron. 'Rights'. in *The Blackwell Encyclopaedia of Political Thought*. D. Miller (ed.), Blackwell, Oxford, 1987. **2-**M.S. Golwalkar. *We or Our Nationhood Defined*. Nagpur: Bharat Publications, 1939. **3-**M.S. Golwalkar. *Bunch of Thoughts*. Bangalore: Jagarana Prakashana, 1980. **4-**Riaz Ahmad Saeed. "Human Rights in Islam and the West: The Last Sermon of the Prophet and UDHR". *Jihat al-Islam* Vol.6 (January-June 2013) No.2. **5-**Sushila Ramaswamy. *Political Theory: Ideas and Concepts*. Delhi: PHI Learning, 2015. **6-**V.D. Savarkar. *Hindutva: Who is a Hindu?* Bombay: Veer Savarkar Prakashan, 1969.

☆ خان یاسر۔ وطن پرستی نہیں، وطن دوستی۔ دہلی: منشورات ۲۰۱۶ء۔ ☆ ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، لاہور: نگارشات ۲۰۱۳ء۔ ☆ ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ ''دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور: عہد نبوی کی ایک اہم دستاویز''۔ مقالات حمید اللہ (مرتبہ زیبا افتخار) ص ۱۰۱۔۷۶، کراچی: قرطاس ۲۰۰۴ء۔ ☆ شبلی نعمانی۔ ''الجزیہ''۔ مقالات شبلی، جلد اول ص ۲۱۹۔۲۰۹، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین ۱۹۹۹ء۔ ☆ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ مسئلہ قومیت، دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی ۱۹۷۷ء۔ ☆ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ الجہاد فی الاسلام، دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی ۱۹۸۸ء۔ ☆ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ انسان کے بنیادی حقوق، دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی ۲۰۱۱ء۔ ☆ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق، دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی ۱۹۹۳ء۔ ☆ مولانا سید جلال الدین عمری۔ اسلام انسانی حقوق کا پاسباں، دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی ۲۰۰۸ء۔

اخبار علمیہ

''مکہ ڈیجیٹل ریسرچ گیٹ کا آن لائن افتتاح''

مکہ مکرمہ کے گورنر شہزادہ خالد بن فیصل نے بدھ کو جدہ گورنر ہاؤس میں شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی کے سربراہ کی موجودگی میں مکہ ڈیجیٹل ریسرچ گیٹ کا آن لائن افتتاح کیا ہے۔ مکہ کلچرل فورم نے ''مثال کس طرح بنیں'' کے عنوان سے متعدد پروگرام تیار کیے ہیں۔ یہ اس پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ اس موقع پر خالد الفیصل نے اپنے خطاب میں کہا کہ امت کے بغیر تمدن کا تصور نہیں۔ نصب العین کے بغیر امت کا وجود نہیں، نصب العین منصوبہ کے بنا نہیں اور منصوبہ انسان کے بغیر نہیں۔ یونیورسٹی کے سربراہ نے مکہ ریسرچ گیٹ کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ اس کا مقصد مکہ میں ماحولیاتی، طبی، صنعتی، انتظامی اور معاشرتی واقتصادی مسائل حل کرنے کے لیے تحقیق اور جدت طرازی کو فروغ دینا ہے۔ ریسرچ اور جدت طرازی کا کام ڈیجیٹل پلیٹ فارم کے ذریعہ انجام دیا جائے گا۔ سائنس داں، محقق اور جدت طراز انوکھے سائنسی حل پیش کریں گے، بہترین حل پر بیس لاکھ ریال بطور انعام تقسیم ہوں گے۔ انہوں نے مزید کہا کہ مکہ ریسرچ گیٹ سرکاری و نجی اداروں اور تمام افراد کو مصنوعی ذہانت کے بارے میں نئی نئی معلومات تک رسائی کا موقع فراہم کرے گا۔ (اردو نیوز، گھریلو صفحہ، ۱۱/۱۱/۲۰ء)

''بنگلہ دیش میں پہلے ''اسلامک تھرڈ جینڈر اسکول'' کا قیام''

بنگلہ دیش میں خواجہ سراؤں کے لیے کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیموں کے اعداد وشمار کے مطابق ملک میں ان کی آبادی ۱۵/لاکھ کے قریب ہے لیکن حکومت ایسے شہریوں کی تعداد صرف پچاس ہزار تسلیم کر کے ان کی تعلیم و تربیت اور ہنر سکھانے کی طرف متوجہ ہوئی ہے تاکہ معاشرہ کا یہ طبقہ بھی اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر سماج کے لیے مفید و کارآمد بن سکے۔ رپورٹ کے مطابق بنگلہ دیش میں خواجہ سراؤں کے ساتھ دوسرے درجے کے شہری جیسا برتاؤ کیا جارہا تھا۔ انہیں حق رائے دہی اور دوسرے سماجی حقوق بھی حاصل نہیں تھے، تاہم ۲۰۱۳ء سے انہیں یہ اور دوسرے حقوق فراہم کیے جارہے ہیں۔ ان ہی اصلاحات اور فلاحی کاموں میں یہ خبر بھی دلچسپی سے پڑھی جائے گی کہ بنگلہ دیش میں

خواجہ سراؤں کو دینی تعلیم سے روشناس کرانے کے لیے پہلا مدرسہ ''اسلامک تھرڈ جینڈر اسکول'' کے نام سے قائم کر دیا گیا ہے۔ اس میں لازمی اسلامی تعلیم کے علاوہ انگریزی، سائنس، ریاضی، ٹکنیکل اور سماجی علوم کی تعلیم کا نظم کیا جائے گا تاکہ وہ باعزت زندگی اور باوقار روزگار حاصل کرسکیں۔ تاہم فی الحال ۱۵۰؍ بالغ خواجہ سراؤں کو داخلہ دیا جائے گا۔ تعلیم و تعلم کے میدانوں میں اس انوکھے قدم کا استقبال کیا جانا چاہیے۔ (راشٹریہ سہارا، لکھنؤ، ۸ نومبر ۲۰۲۰ء، ص ۹)

''درختوں پر تیر داغنے والے ڈرون''

موسمیاتی تحقیق، جنگلات کے جائزہ اور آتش زدگی کے وجوہ معلوم کرنے کے لیے درختوں پر برقی سینسر لگائے جاتے ہیں۔ اب ماہرین نے ڈارٹ (تیر) ڈرون کے ذریعہ درختوں پر سینسر پھینکنے کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ امپیریل کالج کے سائنس دانوں کے مطابق گھنے جنگلات میں ہر درخت پر سینسر لگانا محال ہے۔ اس کے لیے انھوں نے یہ ڈارٹ ڈرون بنایا ہے۔ یہ ڈرون چھوٹے تیروں کی مدد سے برقی سینسر برساتے ہیں جو درختوں پر چپک جاتے ہیں۔ درختوں اور جنگلات میں جز وقتی اور مستقل بنیادوں پر وائرلیس سینسر لگا کر ان سے جنگلات اور موسمیات کا حال معلوم کیا جارہا ہے۔ اگرچہ یہ سینسر ڈرون کے ذریعہ جنگلات کے فرش پر بھی گرائے جاسکتے ہیں لیکن ان کی گمشدگی کے امکان کے سبب اصل مقام معلوم کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اب تیر نما ساخت پر سینسر لگا کر انہیں تیر کی طرح درختوں سے چپکایا گیا ہے۔ امپیریل کالج کی ٹیم نے سب سے پہلے ایک ڈرون پر تیر پھینکنے والا نظام بنایا۔ اس کے بعد نشانہ لینے کے لیے لیزر سے مدد لی گئی۔ ایک اسپرنگ کی مدد سے سینسر درخت تک پھینکے جاتے ہیں اور خاص شکل میں میموری میٹریل سے انہیں داغا جاتا ہے۔ اس طرح ۶۵۰ گرام کا سینسر کسی تیر کے مانند پرواز کرتے ہوئے درخت میں پیوست ہوجاتا ہے۔ اگر چار میٹر کی دوری سے سینسر پھینکا جائے تو یہ اپنے ہدف دس سینٹی میٹر کے دائرہ میں جا لگتا ہے۔ اگر فاصلہ کم ہو تو ۱۰؍ سینٹی میٹر کی درستگی مزید بہتر ہوسکتی ہے لیکن ابتدائی تجربات میں ڈارٹ (تیر) لگے سینسر ٹکرا کر واپس آئے اور ضائع ہوئے۔ اگلے مرحلہ میں برقی سینسر کو درختوں پر چپکانے والا پورا نظام دوبارہ بنایا جائے گا۔ اس ضمن میں ایک ویڈیو بنائی گئی ہے جس میں ایک ڈرون ایک مرتبہ چارج ہونے پر ۱۷؍ برقی سینسر

چھینک سکتا ہے۔(صحافی دکن، حیدرآباد، ۱۰/۱۱/۲۰ء، صفحہ سائنس و ٹکنالوجی)

’’جاپان میں خودکشیوں میں اضافہ کے سبب کی نشاندہی‘‘

ترقی یافتہ ملکوں کے گروپ جی۔۷ میں جاپان کو سب سے زیادہ خودکشی کے واقعات کا افسوس ناک امتیاز حاصل ہے۔تاہم ۲۰۰۳ء میں جب جاپان میں خودکشی کے ۳۴۴۲۷ واقعات درج ہوئے تو وہاں کی ملکی قیادت کو بڑی فکر لاحق ہوئی اور پالیسی سازوں نے ۲۰۰۷ء میں اس کے تدارک کے لیے ایک جامع منصوبہ بنایا جس کے تحت حکومت اور بلدیہ مشترکہ طور پر ایسے افراد اور جماعت کی نشاندہی کرتے ہیں جن کی خودکشی کے خدشات زیادہ ہوتے ہیں۔وہ ان کی مالی واقتصادی اور ذہنی پریشانیوں کو دور اور انہیں مناسب مشورے بھی فراہم کرتے ہیں۔لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود خودکشی کا سلسلہ تھما نہیں اور گزشتہ برس ۲۰ ہزار سے زیادہ افراد نے اپنے ہاتھوں سے اپنی جانیں لیں۔ پچھلے چار مہینوں سے اس تعداد میں مسلسل اضافہ اور اکتوبر میں یہ پانچ برس سے زیادہ عرصہ کی اپنی بلندترین سطح پر پہنچ گئی ہے۔حیرت انگیز اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ ماہرین اس کے لیے کرونا وائرس کے سبب لاحق ہونے والے اقتصادی مضمرات کو مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں۔اس کا زیادہ شکار خواتین ہورہی ہیں۔پولیس کی طرف سے جاری کردہ حالیہ ابتدائی اعداد و شمار کے مطابق اکتوبر میں مجموعی طور پر ۲۱۵۳/افراد نے خودکشی کرلی جو ستمبر کے مقابلہ میں ۳ سو زیادہ تھی اور یہ مئی ۲۰۱۵ء کے بعد سے کسی ایک ماہ کے دوران خودکشی کی سب سے بڑی تعداد ہے۔اکتوبر میں ۸۵۱ خواتین نے خودکشی کی جو ۲۰۱۹ء میں اسی ماہ کے مقابلہ میں ۸۲ء۶ فیصد زیادہ ہے۔دوسری طرف مردوں کی خودکشی کی تعداد میں گزشتہ جولائی تک مسلسل گراوٹ آرہی تھی لیکن اس وبا کی وجہ سے اقتصادی صورت حال پر پڑنے والے اثرات کے سبب خودکشی کی تعداد میں ۲۱ء۳ فیصد کا اضافہ شروع ہوگیا۔ان کا کہنا ہے کہ خواتین اس لیے زیادہ متاثر ہورہی ہیں کیوں کہ ملازمتیں کم ہوگئی ہیں جس کے سبب بیشتر خواتین بے روزگار ہوگئی ہیں۔(روزنامہ اردو ٹائمز، ممبئی، ص۶، ۱۲/۱۱/۲۰ء)

(ک۔ص۔اصلاحی)

معارف کی ڈاک

مکتوب پاکستان

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ایک عرصے کے بعد خدمت میں غائبانہ حاضری کا شرف حاصل کررہا ہوں۔ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ کی مسئولیت گزشتہ چھ سالوں سے میرے ذمے ہے۔ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۰ میں مکمل ہوگیا تھا جس میں بعض وجوہات کی بنا پر پچیس صد عنوانات پر مقالات شامل نہ کیے جاسکے تھے۔ اس دوران میں سینکڑوں نئے عنوانات سامنے آئے، (مثلاً شخصیات کے ضمن میں سید ابوالاعلیٰ مودودی، سید ابوالحسن علی ندوی، علی جاہ عزت بیگو وچ، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مولانا منظور نعمانی، عبدالشکور لکھنوی، قاری محمد طیب قاسمی، اسی طرح ملکون، سے متعلق بہت سے عنوانات، جماعتوں: تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی، جمعیۃ علماے ہند، جمعیت مرکزیہ تبلیغ الاسلام انبالہ و کانپور، امارت شریعت بہار؛ اخبارات وجرائد: ہمدرد، کامریڈ، الجمعیۃ، معارف، مدینہ)۔ اس خلا کو پر کرنے کے لیے اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ کے تکملے کی تدوین کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ تکملے میں پاکستان و ہند پر خاص توجہ دی جائے گی۔ کوشش ہوگی کہ اس خطے کی کوئی اہم شخصیت، انجمن، ادارہ اور جماعت ایسی نہ رہ جائے کہ جس پر مقالہ شامل نہ ہو۔

اس وسیع منصوبے کی تکمیل بھارت میں مقیم ہمارے قابل احترام اہل قلم کے قلمی تعاون کے بغیر کسی طور پر بھی ممکن نہیں۔ آج امارت شریعت بہار، ندوۃ المصنّفین، مولانا تقی امینی، سعید احمد اکبرآبادی، جامعہ ملیہ، جامعہ عثمانیہ، دائرۃ المعارف العثمانیہ، دائرۃ المعارف النعمانیہ، قاضی عبدالودود، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا احمد سعید دہلوی، دارالعلوم دیوبند، غرض سینکڑوں عنوانات ایسے ہیں جن پر مقالات آپ احباب کے قلمی تعاون کے بغیر دائرۃ المعارف کا جزو نہیں بن سکتے۔

اس لیے اہل علم کی ایک فہرست (نام، فون، ای میل) مطلوب ہے جو اردو دائرۃ المعارف کے لیے مقالہ نگاری کرسکتے ہوں۔

نیازمند

(جناب) محمد ارشد

معارف: قارئین معارف سے بھی تعاون کی درخواست ہے۔

مکتوب ملیشیا

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف (اکتوبر ۲۰۲۰ء) میں محترم پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب مرحوم کے بارے میں ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی کا مراسلہ پڑھ کر کافی متاثر ہوا اور شعبۂ تاریخ میں مرحوم سے قریبی تعلقات اور ان کی علمی رہنمائی کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ بلاشبہ پروفیسر محمد یٰسین صاحب نے ایسے بہت سے لوگوں پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں جوان سے قریب رہے اور ان کی تعلیم وتربیت سے مستفیض ہوئے، ان میں میں بھی شامل ہوں۔ واقعہ یہ کہ ایک سچے مربی کی حیثیت سے انہوں نے بہت سے طلبہ، ریسرچ اسکالرس اور علم کے شائقین کو رہنمائی بہم پہنچائی اور انہیں اپنے فراخ دلانہ تعاون سے نوازا، میرے سپر وائزر دوسرے تھے لیکن ان کی یہ کرم فرمائی کہ میرے ریسرچ کے کاموں اور ان کی تکمیل کے مسائل کے حل میں کافی مدد کی۔ فارسی مآخذ سے استفادہ کی راہیں ہموار کرنے اور میری انگریزی صلاحیت نکھارنے میں انہوں نے مجھے خصوصی تعاون دیا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۸۳ء کی موسم سرما کی تعطیل کے دوران انہوں نے اپنے گھر پر کئی روز تک میرے ایم۔فل مقالہ کی تصحیح اور اسے بہتر بنانے میں کئی گھنٹے صرف کیے اور بعض دفعہ دوپہر کو دیر ہوجاتی تو اپنے ہاتھ کے پکائے ہوئے کھانے سے مجھے بھی لطف اندوز کرتے (اس دوران ان کے اہل خانہ گھر گئے ہوئے تھے) واقعہ یہ کہ ایک شفیق استاد و مربی کی حیثیت سے ان کے احسانات کو بھلایا نہیں جاسکتا۔

مجھے انتہائی افسوس ہے کہ علی گڑھ سے رخصت ہوکر ملیشیا میں مقیم ہوجانے کے بعد مرحوم سے باقاعدہ رابطہ نہ رکھ سکا، اس کا مجھے شدید احساس ہے اور میں اپنی اس کوتاہی کا اعتراف کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ رب کریم پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب کی مغفرت فرمائے، ان کی دینی وعلمی خدمات کو قبولیت سے نوازے، جنت الفردوس میں انہیں بلند مقام عنایت کرے اور ان کے گھر والوں پر اپنا فضل فرمائے۔

والسلام

(ڈاکٹر) ارشد اسلام

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ تاریخ وثقافت

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ملیشیا

مکتوب بہار

۲۰۲۰/۱۰/۲۴ء

محترمی! تسلیم

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے سات خطوط مرتب کر کے ارسال کر رہا ہوں، لیکن مبادا اس مضمون کا بھی کہیں وہی حشر نہ ہو جائے جو سابق مضمون کا ہوا، ہاں اس مضمون میں حشو و زوائد ہوں تو آپ انہیں حذف کر سکتے ہیں۔

میری طبیعت ایک مہینہ سے ناساز ہے، اندیشہ ہے کہ میرے بعد کہیں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے یہ قیمتی خط ضائع نہ ہو جائیں اس لیے بڑی عجلت میں ان خطوط کو مرتب کر کے ارسال کر رہا ہوں۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے ماہنامہ ادبیات کے صرف تین شمارے منظر عام پر آئے تھے کہ اس کو نظر بد لگ گئی، اس لیے میری کئی چیزیں شائع ہونے سے رہ گئیں۔

یہاں معارف جولائی ۲۰۲۰ء کی غزل کا درج ذیل مصرع:

ناخدائے بحر دانش بے بصر ہوتا گیا

اس طرح کمپوز ہو گیا ہے:

ناخدائے اے بحر دانش بے بصر ہوتا گیا

اس میں ''اے'' حرف ندا زائد ہے جس کی وجہ سے یہ مصرع وزن سے خارج ہو گیا ہے اور شعر کا مفہوم بھی متاثر ہو رہا ہے۔

دوسرا شعر ہے:

رہ بروں میں احترام ملک و ملت کچھ نہیں جذبۂ حب وطن زیر و زبر ہوتا گیا

پہلے مصرعے میں ''رہ بروں'' کی جگہ رہروؤں کمپوز ہو گیا جو مناسب نہیں۔

معارف ستمبر ۲۰ء کی غزل کا یہ شعر دیکھیے:

نذر طوفاں خشکی ساحل نہ رب کر دے اسے وہ جو پندارِ سکوں آسودۂ ساحل میں ہے

پہلے مصرعے میں ''خشکی ساحل'' کی بجائے ''خشک سالی'' کمپوز ہو گیا ہے جس کی وجہ سے یہ شعر اپنی معنویت کھو بیٹھا ہے، اس پر ایک صاحب نظر نے اعتراض بھی کیا تھا۔

فون پر:

آپ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ نثر میں کمپوزنگ کی غلطی سے کوئی خاص اثر نہیں پڑتا لیکن اشعار میں کمپوزنگ کی غلطی سے یا تو اشعار غیر موزوں ہوجاتے ہیں یا اپنی معنویت کھوکر مہمل ہوجاتے ہیں، اس لیے منظوم کلام کی پروف ریڈنگ ذہن حاضر رکھ کر کرنی چاہیے:

مجھے خوف ہے کہ میری بات کہیں نہ خاطر معصوم پر گراں گزرے

والسلام نیازمند

(جناب) وارث ریاضی

مکتوب بیگوسرائے

از بیگوسرائے، ۶/۱۱/۲۰۲۰ء

۱۰/ربیع الاول ۱۴۴۲ھ

مکرمی! سلام مسنون

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

حسب گفتگو "رہنمائے اردو" حصہ اول کے سرورق پھر اس کے بعد والا ورق اور آخری سرورق وفارسی عکسی نقل وہاٹس ایپ کے ذریعے بھیج رہا ہوں، علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

لیکن یہ خلجانی کیفیت اس وقت بھی برقرار رہتی ہے اگر ان کی کتابیں ناپید ہونے لگیں یا لوگ ان تک نہ پہنچیں یا پہنچنے کی کوشش نہ کریں۔

بہرکیف آپ جس علمی جزیرے میں رہتے ہیں تو ممکن ہے کہ مذکورہ مرسلہ فہرست میں مندرج کتابوں کے سلسلے میں مدد و رہنمائی حاصل ہوسکے۔

خدا آپ کو صحیح سلامت رکھے تا کہ آپ مسرور و بامراد رہیں، اپنے جملہ احباب و متعلقین کی خدمت میں ہدیہ تسلیم کی پیشکش کے ساتھ قلم انداز ہوتا ہوں۔ فقط

نیاز کیش (جناب) راجو خان

خداداد منزل، موضع سیوری، پوسٹ منجھول

ضلع بیگوسرائے (بہار)۔۸۵۱۱۲۷

ادبیات

طلوع صبح

جناب الطاف احمد اعظمی

سحر خیزی کی عادت ہے پرانی سناتا ہوں میں اک رنگیں کہانی

اندھیرا جارہا ہے رفتہ رفتہ اجالا آرہا ہے رفتہ رفتہ

طلوعِ صبح کا منظر ہے دلکش نظر یہ دیکھ کر کرتی ہے عش عش

نمودِ مہر تو ہے اک بہانہ لٹا دینا ہے فطرت کا خزانہ

لیے ہر شے ہے آنکھوں میں فسانہ سناتی ہے فضا رنگیں ترانہ

نگارِ صبح کی جلوہ طرازی سحر آگیں ہے طرزِ دل نوازی

وفورِ شوق میں گل جھومتا ہے چمن کا ذرہ ذرہ بولتا ہے

چٹک کلیوں کی اک طرفہ ادا ہے تبسم گل کا ہر غم کی دوا ہے

مچلتی ہے یوں برگِ گل پہ شبنم نظر کا تار ہوجاتا ہے برہم

سر شاخ چمن نغمہ سرائی کوئی بلبل کی دیکھے خوش ادائی

فضا میں ہر طرف بکھری ہے خوشبو صبا اٹکھیلیاں کرتی ہے ہر سو

نہا کر سبزہ و گل روشنی میں عبادت کررہے ہیں بے خودی میں

عجب مستی میں فطرت جھومتی ہے
جہانِ راز کے در کھولتی ہے

آر، زیڈ-۹۰۱، بی، فلیٹ نمبر ۴۰۲، گلی نمبر ۲۴، تغلق آباد ایکسٹینشن، نئی دہلی۔

مطبوعاتِ جدیدہ

نقد و نظر از مولانا محمد یوسف لدھیانوی، مرتب: مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات جلد اول ۷۲۰، جلد دوم ۷۴۴، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ ختم نبوت، پرانی نمائش، ایم۔ اے۔ جناح روڈ، کراچی، پاکستان۔

ان دو ضخیم جلدوں میں ایک ہزار سے زیادہ کتابوں پر تبصرے ہیں جو پاکستان کے مشہور علمی و مذہبی رسالہ بینات میں شائع ہوتے رہے ہے، مولانا یوسف لدھیانوی جن کو شہید الاسلام کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے اور جن کے فتاویٰ ہندوستان کے رسائل و جرائد میں کثرت سے نقل ہوتے رہے اس لیے مولانا مرحوم کی شخصیت یہاں بھی پاکستان کی طرح بڑے احترام کی نظر سے دیکھی گئی، اب تبصروں کے اس مجموعہ سے مولانا کے مطالعہ و تجزیہ کی صفت بھی نمایاں ہوگئی، تبصرہ واقعی کیسے نقد و نظر کے مترادف ہوجاتا ہے اس کی بہترین مثال زیر نظر مجموعہ ہے، پہلی جلد میں قرآنیات، حدیث، سیرت، تذکرہ صحابہ کرام، عقائد، فقہ و فتاویٰ، تصوف اور سوانح کے زیر عنوان کتابیں ہیں تو دوسری جلد میں تاریخ، مقالات، مکتوبات، ادبیات، مواعظ و ملفوظات، اصلاحی کتب، وظائف، رسائل و جرائد، صرف و نحو اور فنون درس نظامی، فرق باطلہ، عقیدہ حیات انبیا، مولانا مودودی اور جماعت اسلامی، اہل حدیث، بریلوی مکتب فکر، انکار حدیث، ناصبیت، خارجیت، رافضیت، اسماعیلی، بوہرہ، آغاخانی، عیسائیت، قادیانیت کے تحت زیر تبصرہ کتابوں کا ذکر ہے، اس فہرست سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مصنّفین اور ناشرین نے مولانا مرحوم کے ذوق کا کس درجہ لحاظ رکھا اور حق یہ ہے کہ مولانا نے وسعت مطالعہ کے ساتھ خود اپنے تبحر علمی سے جس طرح کام لیا عام مبصرین سے اس کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی، تبصروں پر تبصرہ کرنے والا بھی معذور ہے کہ وہ مولانا کے نقد و نظر کے اسلوب یا خصائص کو واضح کرسکے، جیسے ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی کتاب زمخشری کی کشاف ہے، تبصرہ نگار سب سے پہلے واضح کردیتے ہیں ''کشاف عربیت و بلاغت کے نکات اور نظم قرآن کے رموز و اسرار میں منفرد ہے، وہاں وہ بدعت و اعتزال کا زہر ایسے حسین پیرایوں میں گھول کر پلاتے ہیں کہ عام آدمی اس کا ادراک بھی نہیں کرسکتا''، بدعت و اعتزال کا زہر اور حسین پیرایہ میں اس کو گھول کر پلانا، اسی سے مبصر مرحوم کی انفرادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، ایک کتاب میں مصنف نے دیندار طبقہ میں اہل قرآن اور اہل حدیث کا ذکر کیا تو مبصر کو یہ بری طرح کھٹکا، فوراً گرفت کی کہ ''اہل قرآن منکرین حدیث کا ٹولہ ہے جس کی فکر ژولیدہ اور نظر مستعار ہے''، فقہ کے

تاریخی ارتقا پر ایک مصنف نے تقلید کے متعلق لکھا کہ اس کی اساس مسلکی تعصب پر رکھی گئی، فکری جمود میں حریت فکر ونظر اور آزادی نقد وجرح کا شائبہ تک نہ تھا، مبصر شہید نے اس رائے کو غیر مقلدانہ ہی نہیں بڑی حد تک ملحدانہ اس لیے خیال کیا کہ یہ اکابر امت سے بدگمانی پیدا کرنا ہے، جہاں جہاں ایسے مقام آئے وہاں مولانا تبصرہ نگار ہی نہیں مقالہ نگار بھی ہو گئے، خاص طور سے جو کتابیں مختلف جماعتوں، فرقوں بلکہ فرق باطلہ کے تعلق سے ہیں، ان پر تبصرہ، پڑھنے والوں کے لیے کتاب کے مشمولات کے ساتھ مولانا کے معلومات کا بہترین ذریعہ بن گیا، مثال کے طور پر قاضی مظہر حسین کی کتاب مولانا محمد اسحاق سندیلوی کا مسلک اور خارجی فتنہ پر ان کا تبصرہ قریب بائیس صفحات کا ہے، اسی طرح مولانا عبدالشکور فاروقی کی کتاب تنبیہ الحائرین پر پندرہ صفحات کا تبصرہ ہے جو مولانا کے خاص نقطہ نظر اور لب ولہجہ کا نمائندہ ہے، اخیر میں لکھتے ہیں کہ مولانا فاروقی کی خیر خواہانہ نصیحت پر برسوں گزر گئے مگر افسوس کہ شیعوں کو اس امتحان گاہِ ایمان میں قدم رکھنے کی ہمت نہیں ہوتی، نہ شاید قیامت تک ہوگی، اسی طرح قاری فیض اللہ چترالی کی کتاب آغا خانیت، علمائے امت کی نظر میں ہے اس پر تبصرہ غضب کا ہے، صرف اسی کے مطالعہ سے اس فرقہ کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے، کم لوگوں کو اسماعیلی بوہرہ وغیرہ فرقوں کے متعلق معلومات ہیں، مولانا مرحوم نے ان پر لکھی گئی کتابوں کا تعارف ہی نہیں کرایا بیش بہا معلومات سے ان کتابوں کی افادیت میں بڑا اضافہ کردیا، غرض نقد ونظر کی یہ دو جلدیں قاری سے صرف ان کتابوں کا تعارف ہی نہیں کراتیں، ان کی غرض وغایت کو اس طرح عیاں کرتی ہیں کہ قاری کے لیے ان کتابوں کا سود وزیاں صاف ظاہر ونمایاں ہوجاتا ہے، دیکھا جائے تو یہ کتابوں کی ''الفہرست'' ہے، خدا جانے کتنی کتابوں سے شناسائی ہوجاتی ہے، کتنوں کو معلوم ہے کہ تفسیر ماجدی کا اشاریہ بھی برسوں پہلے تیار ہو چکا ہے، مولانا شہید نے تفسیر ماجدی کے ''فنی اغلاط اور مضمون کے مخصوص فکری رجحانات'' کا ذکر کیا ہے لیکن اس کی تفصیل نہیں دی، تاہم اشاریہ کی قدر وقیمت کا اعتراف کیا ہے، کتابوں بلکہ علوم اسلامیہ کے قدردانوں کے لیے یہ تبصرے واقعی بہت قیمتی، پُر از معلومات اور دلچسپ ہیں۔

بنیاد کا پتھر از مولانا عبدالقیوم حقانی، متوسط تقطیع، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۷۲، قیمت درج نہیں، پتہ: القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہؓ، خالق آباد، نوشہرہ۔ کے، پی، کے۔ پاکستان۔

مولانا عبدالقیوم حقانی کی یہ کتاب برسوں پہلے آئی لیکن اس کے ذکر کی باری اب اس طرح

آئی کہ معذرت وشرمندگی کو بھی شرم آئی، خدا جانے کتنی کتابیں اپنی وقعت، ضرورت اور اہمیت کے لحاظ سے ان صفحات اور ان سطروں سے ناراض ہونے کا حق رکھتی ہیں کہ ان کی صحیح قدر نہ کی گئی، اس کتاب کے ٹائٹل پر ہی ایک جملہ کا دعویٰ بھی ہے اور شاید تعارف وتبصرہ بھی کہ ''اپنے موضوع پر پہلی اور مستقل کتاب'' ٹائٹل ہی پر اس اجمال کی وضاحت بھی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ ادارے ہوں، منتظمین ہوں، تحریکیں ہوں، بڑے ناموں کے ساتھ یاد کی جاتی ہیں مگر اصل تو وہ کارکن ہیں جن کی محنت اور خلوص سے یہ ادارے بنتے ہیں مگر ان کو عام دنیا جانتی تک نہیں، ہاں قریب سے دیکھنے والوں کے لیے ان کی حیثیت بنیاد کے پتھر کی ہوتی ہے، ساری عمارت اسی پر قائم ہے اور وہ سارا بوجھ لیے ہوئے اپنی شناخت کو مستور رکھنے پر مجبور، عموماً ایسے لوگوں کے احوال سے چشم پوشی اختیار کی جاتی ہے مگر اس کتاب میں پاکستان کے ایک مشہور اہل قلم اور خدا جانے کتنے اداروں کے روح رواں اور ایک خاص قسم کی تحریر سے منفرد شان رکھنے والے اور کہا جائے تو دور جدید کے خواجہ حسن نظامی، مولانا عبدالقیوم نے یہ جدت اپنے نام کی اور اپنے ایک عزیز رفیق کی دلچسپ روداد حیات تیار کردی اور ان ہی کے الفاظ میں پٹھانوں والی اردو میں ایک چھوٹی سی کہکشاں سجانے کی کوشش کی، شروع میں انہوں نے اچھا کیا جو بنیاد کے پتھر کو چومنے والوں کی کچھ مثالیں دے دیں، اس کتاب کا ایک مقصد یہ بھی بتایا گیا کہ بنیاد کے پتھر یا پتھروں کو یہ کہنے کا حوصلہ بجا طور پر مل جائے کہ شامل جمال گل میں ہمارا لہو بھی ہے، کتاب قابل دید ہے اور قابل داد بھی۔

کلام دانش از محمد مزمل عباسی دانش، مرتب ابوسفیان محمد عامر عباسی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۴۸، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: محمد عارف عباسی، عباسی کمپاؤنڈ، نظام پور، گورکھپور (یو۔پی)۔

ایسے مجموعہ کلام کے متعلق کچھ کہنا لاحاصل ہے جس کا شاعر خود یہ یقین رکھتا ہے کہ اس کا ہر شعر عیوب شاعری سے پاک ہے اور جو اسے بے ہنر سمجھے وہ خود بے ہنر ہے، واقعی یہ دعویٰ بے دلیل بھی نہیں، نعت کا یہ مصرعہ ہی کافی ہے ع: دیکھو تو خاک میں بھی تڑپ کہکشاں کی ہے، ہر شعر روایت کی پاسداری یعنی شاعری میں شرافت کی عمل داری، اب یہ شعر بھی ملاحظہ ہو:

پھونک دے قلب وجگر کو نہ کہیں آتش غم آنکھ ہم آنسوؤں سے اس لیے تر رکھتے ہیں

کسی نے کلام دانش کو کمال دانش کہا، کچھ غلط نہیں کیا۔ (ع۔ص)

رسید کتب موصولہ

اسلام، امن و سلامتی کا راستہ: پروفیسر اختر الواسع، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی

قیمت ۱۵۰/روپے

ایم اسلم: بچوں کے ناول نگار، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بک امپوریم، پٹنہ

قیمت ۱۰۰/روپے

ترسیل و تفہیم: بچوں کے ناول نگار، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، دانش محل لکھنؤ

قیمت ۲۵۰/روپے

عکس سیرت: مترجم خلیل الرحمٰن پرنٹرز و پبلشرز، کولکاتا قیمت ۲۵۰/روپے

کتاب تمسک: پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، براؤن بکس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

قیمت ۵۰۰/روپے

کرونا وائرس-افسانچے: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ممبئی قیمت ۱۵۰/روپے

کرونا وائرس منظوم: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ قیمت ۲۰۰/روپے

منزل بہ منزل (دانش گاہ اسلامیہ ہائی اسکول): الحاج ڈاکٹر عبدالرؤف، دانش گاہ اسلامیہ ہائی اسکول، آسنسول، مغربی بنگال قیمت ۱۵۰/روپے

مناظر عاشق ہرگانوی کی آفاقی بصیرت، کتابوں کے حوالے سے: پروفیسر محمد محفوظ الرحمٰن، راعی بکڈپو، الہ آباد قیمت ۱۰۰/روپے

نقوش حیات: مفتی محمد عبداللہ پھولپوری، خانقاہ شاہ ابرار مدرسہ بیت العلوم اورنگ آباد، مہاراشٹر

قیمت درج نہیں

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبیؐ		اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	100/-
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-	سفرنامہ روم و مصر و شام	200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی		کلیات شبلی (اردو)	220/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-	کلیات شبلی (فارسی)	45/-
الفاروق	300/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
الغزالی	200/-	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	
المامون	175/-	مقالات شبلی دوم (ادبی) 〃	70/-
سیرۃ النعمان	300/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی) 〃	80/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) 〃	200/-
شعرالعجم اول	300/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی) 〃	150/-
شعرالعجم دوم	150/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی) 〃	90/-
شعرالعجم سوم	125/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) 〃	100/-
شعرالعجم چہارم	200/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) 〃	110/-
شعرالعجم پنجم	150/-	خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-	انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی		مکاتیب شبلی اول 〃	150/-
الکلام	250/-	مکاتیب شبلی دوم 〃	190/-
علم الکلام	200/-	اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
DECEMBER 2020 Vol - 206 (6)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/022
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

۱۔	سیر الصحابہ اول	حاجی معین الدین ندوی	300/-
۲۔	سیرت عائشہؓ	مولانا سید سلیمان ندوی	220/-
۳۔	حیات شبلی	مولانا سید سلیمان ندوی	650/-
۴۔	تذکرۃ الفقہاء اول	مولانا عمیر الصدیق ندوی	150/-
۵۔	مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	240/-
۶۔	حکیم الامت۔نقوش وتاثرات	مولانا عبدالماجد دریابادی	400/-
۷۔	علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	180/-
۸۔	تاریخ اسلام (اول ودوم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	370/-
۹۔	تاریخ اسلام (سوم وچہارم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	500/-
۱۰۔	تاریخ دولت عثمانیہ اول	محمد عزیز (علیگ)	300/-
۱۱۔	تاریخ دولت عثمانیہ دوم	محمد عزیز (علیگ)	300/-
۱۲۔	تاریخ ارض القرآن (اول ودوم)	مولانا سید سلیمان ندوی	375/-
۱۳۔	تاریخ اندلس اول	سید ریاست علی ندوی	350/-
۱۴۔	تاریخ اندلس دوم	سید ریاست علی ندوی	220/-
۱۵۔	تاریخ اندلس سوم	سید ریاست علی ندوی	300/-
۱۶۔	مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت	محمد سعود عالم قاسمی	300/-
۱۷۔	عہد اورنگ زیب میں علما کی خدمات	ڈاکٹر علاء الدین خاں	380/-
۱۸۔	تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں	ظفر الاسلام اصلاحی	100/-
۱۹۔	آثارِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	500/-